ISSN 0974-7346

جنوری ۲۰۲۳ء

جلد ۲۱۰—عدد ۱

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زرتعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۰	ماہ جمادی الاخریٰ ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۲۳ء	عدد ۱

دار المصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اردو کے علمی و مذہبی اور بڑی حد تک ادبی رسائل کی مدیرانہ گفتگو میں موضوعات کا تنوع ہمیشہ رہا، جس میں اصلاحی کوششوں، مذہبی قدروں اور ادبی رویوں کے ساتھ سیاسی تغیرات پر بھی اظہار خیال شامل ہے۔ گو سیاست کے وقتی مسائل کے لیے باتیں بس حسب ضرورت ہوتی ہیں، لیکن ادھر کئی برسوں سے سیاست نے جو روش اختیار کی اس کی وجہ سے اداریوں میں اسی سیاسی عنصر کا غلبہ زیادہ ہو گیا۔ اس کے لیے معذرت کے ساتھ ضرورت کا جواز بھی ہے۔ پوری دنیا سے قطع نظر ہمارے ملک کی یہ عجیب داستان ہے کہ سیاست کا محور پندرہ بیس فیصد آبادی کا وجود ہے۔ اب تو عالم یہ ہے کہ ہر نیا دن کسی نئے ستم کی ایجاد کی خبر لاتا ہے اور بتاتا جاتا ہے کہ ع ناوک نے ترے صید نہ چھوڑے زمانہ میں

گذشتہ مہینے پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں ایک رکن نے یکساں سول کوڈ پر بل پیش کیا۔ چوں کہ رکن کا تعلق حکمراں جماعت سے تھا اس لیے حزب مخالف کی مخالفت اور احتجاج کے باوجود اس کو بڑی آسانی سے منظور کر لیا گیا۔ یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی نیت آزادی کے بعد ہی سے ایک خاص طبقہ کے دل و دماغ میں پنپتی رہی اور کسی نہ کسی شکل میں اس کی خواہش کا اظہار بھی ہوتا رہا۔ آئین سازی کے وقت ہندوستان کو جمہوری ملک قرار دیتے ہوئے ہر ہندوستانی کے ذاتی رجحانات، افکار و عقائد، مذہب و تہذیب کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان کا نظام حکومت کسی خاص مذہب کا پابند نہیں ہوگا اور ہر شہری کو اپنے طور پر مذہبی امور میں آزادی حاصل رہے گی۔ مذہبی امور ہی کا دوسرا نام پرسنل لا یعنی عائلی قوانین تھا۔ دفعہ ۲۵ کے تحت بنیادی حقوق میں یہ بات شامل ہوئی لیکن اس صراحت کے بعد رہنما اصول کے نام سے دفعہ ۴۴ میں یہ جملہ زائدہ بھی درج کرا دیا گیا کہ ''ریاست کوشش کرے گی کہ پورے ملک میں شہریوں کے لیے یکساں سول شہری قانون ہو''۔ یہ جملہ ان لوگوں کے لیے ایسا ہتھیار بن گیا جو جمہوریت اور نامذہبیت سے آزادی کے روز اول ہی سے نالاں تھے۔ وقتاً فوقتاً عدالتوں میں کچھ ججوں کے ذریعے یکساں سول کوڈ کی یاد دلائی جاتی رہی۔ قومی یک جہتی اور مسلمان عورتوں کے حقوق کی پاسداری کی دہائی بھی غیر متعلق قضیوں کے فیصلوں میں بھی دی جاتی رہی۔ کبھی کبھی قانونی اداروں کے ذمہ داروں کا لب و لہجہ، قانون سے بالاتر بھی ہو جاتا جیسے ایک زمانہ میں لا کمیشن کے چیرمین گجندر گڈکر نے کہہ دیا تھا کہ ''مسلمانوں کو یونیفارم سول کوڈ قبول کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لینا

چاہئے۔ اگر انہوں نے خوش دلی کے ساتھ یہ تجویز منظور نہیں کی تو قوت کے ذریعہ یہ قانون نافذ کیا جائے گا''۔ یہ الفاظ ۱۹۷۳ء کے ہیں، جب فسطائی ذہن اپنا کام تو کر رہے تھے لیکن عملاً اپنی طاقت کے اظہار سے محروم تھے۔ آئین سازوں کی نیت پر شبہ کرنے کا یوں تو ثبوت پیش کرنا مشکل ہے کہ ان میں ڈاکٹر امبیڈکر جیسے لوگ تھے، جنہوں نے دفعہ ۴۴ کی شمولیت کے ساتھ یہ بھی صراحت کر دی تھی کہ ''(دفعہ ۴۴) کے ذریعے حکومت کو محض ایک اختیار دیا جا رہا ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ پرسنل لا کو ختم کر دینا اس کے لیے لازمی ہوگا۔ کسی کو یہ اندیشہ نہیں ہونا چاہئے کہ محض اس اختیار کے مل جانے سے حکومت اس پر عمل کرنے کے لیے فوراً مصر بھی ہوگی۔ حکومت کے اختیارات عملاً ہمیشہ محدود رہتے ہیں، خواہ آپ انہیں لفظی طور پر کتنا ہی لا محدود کریں کیوں کہ حکومت کو اپنے اختیارات کے استعمال میں مختلف فرقوں کے جذبات کا احترام کرنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی حکومت اپنے اختیارات کو اس طرح استعمال نہیں کر سکتی جس کے نتیجہ میں مسلمان بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر کسی وقت حکومت ایسا کرنے کی سوچے گی تو وہ فاترالعقل ہوگی''۔ ڈاکٹر امبیڈکر اور اس وقت کی حکومت کا جو بھی منشا رہا ہو، لیکن جو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ۲۵ کے ساتھ ۴۴ کی شمولیت اصلاً باغباں بھی خوش رہے اور راضی رہے صیاد بھی، کی وہی تعبیر تھی جو سیاست کی پہلی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ غلط نہیں تھے، ہاں یہ ضرور ہوا کہ بعض ججوں، نوکر شاہوں اور سیاستدانوں کی خواہش بار آور اگر نہیں ہوئیں تو برائے نام ہی سہی، سیکولرزم کے دعویداروں کی شرم بھی تھی کہ عدلیہ اور قانون سازی کے سب سے بڑے اداروں نے یکساں سول کوڈ کو قانونی درجہ دینے میں عجلت نہیں کی بلکہ سیکولر ریاست میں اقلیت کی اہمیت اور اس کے احتجاج کی وجہ سے پارلیمنٹ میں اس کو پیش کرنے سے گریز ہی کیا۔ یا پھر ڈاکٹر امبیڈکر کی یہ تنبیہ ان کے سامنے رہی کہ اگر کسی حکومت نے عوامی جذبات کا لحاظ نہیں کیا تو وہ فاترالعقل ہی کہی جائے گی۔ لیکن اولین قانون سازوں کو شاید اس کا احساس نہیں تھا کہ نفرت کی زیریں لہر کبھی سیلاب بن کر ساری جمہوری خوش فہمیوں کو خس وخاشاک کی طرح بہا لے جائے گی۔ تاریخی سچائیاں کہتی رہ جائیں گی کہ مسلمانوں کے زمانے میں ہندوؤں کی سوسائٹی جوں کی توں رہی، مسلمانوں نے پرسنل لا اور مذہبی مراسم وعقائد میں کس قسم کی مداخلت نہیں کی۔ مغلوں کی باتیں بہت کی جاتی ہیں لیکن یہ بات بھلا دی جاتی ہے کہ مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ نہیں ہونے پایا اور کسی زمانہ میں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمراں قوم کا مذہب محکوموں کا مذہب بنایا جائے۔ اسلامی تاریخ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ لوگوں کے ضمیر کے خلاف کوئی قانون بنایا گیا ہو وغیرہ۔ عجیب بات ہے کہ برائے نام سیکولر پارٹیوں کے دور حکومت میں ایک منظم منصوبہ کے تحت یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی مخالفت میں علماء نہایت شد ومد سے سامنے آئے اور ان کی آواز میں انصاف پسند غیر مسلم طبقہ نے بھی آواز ملائی۔ لیکن اب بل

منظور بھی ہوگیا، بہ زور اس کے نفاذ کی تیاریاں ہیں یعنی اس ملک میں مسلمانوں کو اپنی مذہبی ہدایات کے خلاف نکاح و طلاق اور وصیت و وراثت کے معاملات میں اپنے مذہبی قوانین کی جگہ دوسرے قوانین کا پابند ہونا پڑے گا۔ یونیفارم سول کوڈ کا مطلب مسلم پرسنل لا کا خاتمہ ہے کہ پھر اس کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ بنیادیں صرف سماجی ہوں گی، قرآن و حدیث نہیں۔ کیا زمانے کا انقلاب ہے کہ آئین اور دستور ہند اور حقوق انسانی کی اس درجہ پامالی ہو اور وہ قوم جس کی شناخت مشتعل مزاجی اور جذباتیت سے ہوتی ہو، اس کے ایک طبقے سے یہ آوازیں آرہی ہیں کہ خاموش رہنے ہی میں عافیت ہے۔ ظاہر ہے یہ احساس شکست ویسا ہی ہے جب کبھی یہ کہا جاتا تھا کہ ایک مسجد سے دست بردار ہونے سے اگر ملک میں قومی یک جہتی کو اور مذہبی رواداری کو تقویت ملتی ہے تو حرج ہی کیا ہے؟ کاش سیلاب کی تباہیوں کا صحیح اندازہ کرنے میں بے حسی بلکہ بے غیرتی کی کسک محسوس کی جاتی۔ احساس کا وقت ابھی گذرا نہیں ہے، بس ضرورت ہے تو حالات اور زمانے کی کروٹوں میں چھپے پیغاموں کو کامل شعور کے ساتھ دیکھنے، بھانپنے اور سمجھنے کی۔ ورنہ یہ سول کوڈ تو محض ایک پڑاؤ ہے۔ خدا نہ کرے ایسے موڑ آجائیں جہاں نہ کارواں کی خبر ہو نہ غبار کارواں کا پتہ۔ بس چند بتانے والے یہ کہتے رہ جائیں کہ کیا جانے اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں۔

اس مہینہ بھی غم و اندوہ سے نجات نہیں ملی۔ جناب ڈاکٹر احمد علی برقی کے دل نے اچانک دھڑکنا چھوڑ دیا، اچھے خاصے بستر پر گئے جو قریب چار بجے رات بستر مرگ بن گیا۔ زود گو شاعر تھے، ان کے والد رحمت الٰہی برق، نوح ناروی کے شاگرد اور خود استاد فن تھے۔ احمد علی برقی کو شاعری گویا ورثہ میں ملی، وہ فارسی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو کے شعبہ فارسی سے وابستہ رہے، لیکن سب سے بڑی پہچان ان کی سادگی اور کسر نفسی تھی، اللہ تعالی مغفرت فرمائے۔

معارف میں نئی کتابوں کے تعارف و تبصرہ کا گوشہ ہمیشہ آباد رہا۔ تبصرے کے لیے کتابیں کثرت سے آتی ہیں، جس کی اطلاع رسید کتب موصولہ سے دی جاتی ہے۔ تبصرے کے لیے زمانی ترتیب کے نہ ہونے کی شکایت بعض مخلصین کو بجا طور سے ہوتی ہے۔ اب معارف کی مجلس ادارت نے طے کیا ہے کہ ایک تاریخ کا تعین کرلیا جائے کہ اس سے پہلے کی کتابوں پر تبصرے نہیں شائع ہوں گے اور یہ بھی کہ ہر کتاب پر تبصرہ ضروری نہیں بلکہ مجلس ادارت کی صواب دید پر کتابوں کا انتخاب ہوگا۔

شاہ عبدالقادر دہلوی کی قرآن فہمی

ڈاکٹر محمد انس حسان

لیکچرار گورنمنٹ ملت ایسوسی ایٹ کالج ممتاز آباد، ملتان

anskashmiri@gmail.com

تاریخ ولادت کے اعتبار سے شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء) اپنے بھائی شاہ عبدالقادر دہلوی (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء) سے بڑے ہیں لیکن ترجمہ قرآن کی تکمیل کے اعتبار سے شاہ عبدالقادر کا کام چونکہ شاہ رفیع الدین کے کام سے پہلے مکمل ہوا، اس لیے اسے مقدم کیا گیا ہے۔ شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے چند سال کے تقدم وتاخر سے قرآن کریم کے جو اردو تراجم کیے ان میں بنیادی فرق ''بامحاورہ'' اور ''تحت اللفظ'' کا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ بامحاورہ ہے جبکہ شاہ رفیع الدین کا ترجمہ تحت اللفظ ہے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک ہی وقت میں شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کی تفسیر و ترجمے کا کام کیوں سامنے آیا اور ان میں جوہری فرق کیا ہے؟ یہاں شاہ عبدالقادر اور ان کے ترجمہ قرآن کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ ان کے والد شاہ ولی اللہ نے فہم قرآن کی جو تحریک شروع کی تھی اور ترجمہ قرآن کے جو اساسی اصول وضع کیے تھے، شاہ عبدالقادر نے ان کی کس درجہ رعایت کی ہے۔

شاہ عبدالقادر کی پیدائش ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء میں بمقام دہلی ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ آپ کی پیدائش کے نو سال بعد آپ کے والد شاہ ولی اللہ دہلوی کی وفات ہو گئی اور یوں آپ کی تعلیم و تربیت کی تمام تر ذمہ داری شاہ عبدالعزیز نے نبھائی۔ حکیم محمود احمد برکاتی لکھتے ہیں: ''والد کی وفات (۱۱۳۱ھ) کے وقت صرف نو سال کے تھے اور 'صرف میر' پڑھتے تھے۔ تحصیل علوم شاہ محمد عاشق اور دوسرے علماء سے کی''۔[1]

---

[1] برکاتی، محمود احمد، شاہ ولی اللہ اور ان کے اصحاب، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۶۵

شاہ عبدالعزیز کے علاوہ شیخ محمد عاشق پھلتی سے بھی آپ نے کسب فیض کیا۔ مولوی رحمٰن علی نے لکھا ہے:

درتفسیر و حدیث و فقہ شانی بلند داشت۔ موضح القرآن ترجمہ قرآن مجید بزبان اردو بکمال فصاحت تحریر فرمود کہ بر ماہران محاورہ اردو مخفی نیست ۔[۲]

((شاہ عبدالقادر) تفسیر، حدیث اور فقہ میں بہت اونچا مقام رکھتے تھے۔ موضح قرآن کے نام سے فصیح اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ فرمایا، جس کے بامحاورہ ہونے پر ماہرین متفق ہیں)۔

سر سید احمد خاں آپ کے علم و فضل کے حوالے سے لکھتے ہیں:

آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے۔ زبان کو کیا طاقت کہ ایک حرف معرفت کی صفات سے لکھ سکے اور قلم کی کیا مجال کہ آپ کی مدائح سے ایک ذرہ لکھ سکے۔[۳]

مقالات طریقت میں آپ کا لقب ''معین الحق'' بیان کیا گیا ہے۔[۴] بیعت وارشاد شیخ عبدالعدل دہلوی سے کی۔[۵] تاہم اپنے شیخ کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ اردو زبان کی تحصیل شاہ عبدالقادر نے اپنے وقت کے مشہور شاعر خواجہ میر درد (م:۱۱۹۹ھ/۱۷۰۸ء) سے کی۔[۶] لیکن اس رائے پر مولانا اخلاق حسین قاسمی نے بڑا متوازن تبصرہ کیا ہے:

---

[۲] رحمٰن علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۱۲۹

[۳] سید احمد خاں، آثار الصنادید، سید الاخبار، ۱۸۴۷ء، ص ۵۴۶

[۴] ضیاء، عبدالرحیم، مقالات طریقت، پروگریسو بکس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۶۹

[۵] شاہ عبدالعدل زبیری نقشبندی (م: ۱۲۰۴ھ/۱۷۹۰ء)، خواجہ محمد زبیر مجددی (م: ۱۱۵۱ھ/۱۷۳۹ء) کے خلیفہ و جانشین تھے۔ خانقاہ خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوئے۔ مولانا سید محبوب علی جعفری (م: ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء) نے شاہ عبدالقادر کو شاہ عبدالعدل دہلوی کا خلیفہ و جانشین لکھا ہے (تاریخ الائمہ فی ذکر خلفاء الامہ (قلمی) ہمدرد اسلامک انسٹی ٹیوٹ، دہلی، ص ۵۲۷)۔ لیکن اس کی تصدیق کسی اور تاریخی ماخذ سے ہوتی کہ آپ ان کے جانشین بھی تھے۔

[۶] فراق، ناصر نذیر، لال قلعہ کی ایک جھلک، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۸۸۔ فراق نے شاہ عبدالعزیز کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بھی خواجہ میر درد کے شاگرد تھے جو کہ درست نہیں۔

خواجہ (میر درد) اس دور کے عظیم علماء و صوفیاء میں سے تھے۔ دلی کے بڑے علمی اور دینی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور اسی مناسبت سے ولی اللّٰہی خاندان کے بزرگوں کا خواجہ صاحب سے گہرا تعلق ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زبان کے معاملے میں ان بزرگوں نے خواجہ صاحب سے کچھ استفادہ بھی کیا ہو۔ لیکن استادی اور شاگردی کا تعلق ایسا معمولی تعلق نہیں کہ اس دور کی تاریخیں اس سے خاموشی اختیار کرتیں۔[۷]

شاہ صاحب کی اہلیہ کے نام کے حوالے سے تاریخی مآخذ خاموش ہیں۔ البتہ یہ معلوم ہے کہ آپ کی ایک صاحبزادی زینب تھیں جو شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے مولوی محمد مصطفٰی تحیر سے منسوب ہوئیں۔[۸] ان سے ایک بیٹی ہوئیں جمیلہ[۹] جن کا عقد شاہ محمد اسماعیل شہید سے ہوا۔ ان سے صرف ایک فرزند تولد ہوئے جن کا نام محمد عمر[۱۰] تھا۔ جسمانی اولاد کی طرح آپ نے روحانی اولاد بھی چھوڑی۔ مولانا عبدالحہ لکھنوی نے آپ کے تلامذہ میں مولانا عبدالحہ بڑھانوی، مولانا اسماعیل شہید، مولانا فضل حق خیر آبادی، مرزا حسن علی شافعی لکھنوی، شاہ محمد اسحاق دہلوی، سید محبوب علی جعفری اور سید محمد اسحاق بریلوی کا ذکر کیا ہے۔[۱۱] تاہم مفتی صدرالدین آزردہ اور شاہ محمد یعقوب دہلوی نے بھی آپ سے استفادہ کیا ہے۔[۱۲] نیز سید احمد شہید نے بھی ڈھائی سال تک مسجد اکبر آبادی میں آپ سے کسب فیض کیا ہے۔[۱۳]

---

[۷] قاسمی، اخلاق حسین، محاسن موضح قرآن، ایچ۔ ایم سعید کمپنی، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص ۶۴۔

[۸] کاندھلوی، نورالحسن، شاہ ولی اللہ کے اجداد گرامی، فکر و نظر، اسلام آباد، ج ۱، شمارہ ۲۵، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۰

[۹] تمام مستند مآخذ میں "جمیلہ" لکھا ہے، لیکن مولانا نسیم احمد فریدی نے "کلثوم" لکھا ہے۔ معلوم نہیں مولانا فریدی کا ماخذ کیا ہے۔ حالانکہ ام کلثوم تو شاہ اسماعیل کی بہن تھیں۔ لگتا ہے مولانا فریدی سے یہاں سہو ہوا ہے۔

[۱۰] مولانا شاہ محمد عمر کے حوالے سے کتب میں بکھرا ہوا مواد ملتا ہے۔ تاہم ان کی شخصیت اس قابل ہے کہ ان پر الگ سے تحقیقی کام کیا جائے۔

[۱۱] ان ممتاز تلامذہ کی فہرست تو تقریباً ہر ماخذ میں ملتی ہے لیکن مولانا اخلاق حسین قاسمی نے حکیم مومن خان مومن کو بھی آپ کا شاگرد بتایا ہے (ملاحظہ ہو: محاسن موضح قرآن، ص ۶۹) تاہم دیگر مآخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ یہ تو پتہ چلتا ہے کہ مومن، شاہ اسماعیل شہید کے ہم درس تھے اور سید احمد شہید سے بیعت کر لی تھی لیکن اس قرینہ کی بنیاد پر شاگردی ثابت کرنا مشکل ہے۔

[۱۲] ثریا ڈار، شاہ عبدالعزیز دہلوی اور ان کی علمی خدمات، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۱۵۶۔

[۱۳] چنانچہ امیر شاہ خان لکھتے ہیں: "چھ مہینے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں تربیت لیتے رہے۔ اس کے بعد شاہ

تالیفات میں آپ کا شاہکار ''موضح قرآن'' جو قرآن کریم کا پہلا اردو ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ مولانا عبدالحی لکھنوی نے آپ کے ایک رسالہ ''تقریر الصلوۃ'' کا بھی ذکر کیا ہے۔[14] تاہم اس کے کسی قلمی یا مطبوعہ نسخے کا پتہ نہیں چلتا۔ آپ کی وفات اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے قبل یعنی ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۵ء میں ۶۳ برس کی عمر میں ہوئی اور مہندیان (دہلی) کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

موضح قرآن علمیت، ادبیت اور مقبولیت کے لحاظ سے اردو تراجم میں کیا مقام رکھتا ہے؟ اس کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اہل علم اور ارباب طریقت دونوں اس ترجمے کو ''الہامی'' ترجمہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اردو ترجمہ سے قبل اردو زبان میں کوئی مکمل ترجمہ موجود نہیں تھا، جس کے متعلق کہا جاسکے کہ شاہ صاحب نے اس سے استفادہ کر کے اپنا ترجمہ مکمل فرمایا۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے رائے قائم کی ہے کہ شاہ صاحب اس ترجمے میں ''فتح الرحمٰن'' کے مقلد نظر نہیں آتے بلکہ ترجمے کا ایک ایک جملہ شاہ صاحب کی مجتہدانہ بصیرت کا پتہ دیتا ہے۔[15] تاہم یہ بات اس حد تک تو درست ہے کہ شاہ صاحب نے اس ترجمے میں ترجمہ نگاری کے بعض نئے اسلوب متعارف کروائے لیکن اس کام کو قرآن فہمی کے ولی اللہی تسلسل کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ متوازن تجزیہ شاید یہ ہو کہ شاہ صاحب نے ترجمہ نگاری میں اپنے والد کے وضع کردہ قوانین کی مکمل پاسداری کی ہے اور اس کا اظہار انہوں نے ''موضح قرآن'' کے مقدمے میں بھی کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ان قوانین کی اساس وروح کو مد نظر رکھتے ہوئے فہم وتدبر کے کئی نئے زاویے بھی متعارف کروائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دستیاب علمی وسائل میں اضافے کی یہ روش انہوں نے اپنے والد ہی سے اخذ کی تھی اور یہ ضروری نہیں کہ کسی نئے علمی کام کو متعارف کروانے کے لیے سابقہ علمی کام یا اس کی تقلید کی نفی کی جائے۔

موضح قرآن کا سبب تالیف کیا تھا اور اس کی تالیف میں شاہ صاحب نے کن امور کو پیش نظر رکھا؟ اس کا اندازہ موضح قرآن کے مقدمہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ مقدمہ کی درج ذیل عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ترجمہ قرآن دراصل قرآن فہمی کے اس تاریخی تسلسل کا حصہ ہے جو ان کے والد کے فارسی ترجمہ

عبدالقادر صاحب نے آپ (سید احمد شہید) کو شاہ صاحب سے مانگ لیا اور پورے ڈھائی برس اکبری مسجد میں اپنی خدمت میں رکھا'' (ملاحظہ ہو: ارواح ثلاثہ، ص ۱۰۱)۔

[14] الکھنوی، عبدالحی، الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، مؤسسۃ ہنداوی للتعلیم والثقافۃ، قاہرہ، ۲۰۱۲، ص ۱۱۸

[15] قاسمی، اخلاق حسین، محاسن موضح قرآن، ص ۷۱

قرآن ہی کی ایک کڑی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

اس (اللہ تعالیٰ) کے کلام میں جو ہدایت ہے دوسرے میں نہیں، پر کلام پاک اس کا عربی زبان میں ہے اور ہندوستانی کو اس کا ادراک محال ہے۔ اس واسطے اس بندہ عاجز عبدالقادر کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے والد بزرگوار حضرت شیخ ولی اللہ ابن عبدالرحیم محدث دہلوی ترجمہ فارسی کر گئے ہیں سہل اور آسان، اب ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے۔ الحمدللہ کہ سن ۱۲۰۵ھ میں میسر ہوا۔۔۔ اور اس کتاب کا نام ''موضح قرآن'' ہے یہی اس کی صفت ہے اور یہی اس کی تاریخ ہے ۱۲۰۵ھ۔[۱۶]

شاہ صاحب کی عبارت سے مترشح ہے کہ اس ترجمے کی ضرورت انہیں اس لیے محسوس ہوئی کہ عوامی سطح پر فہم قرآن کو متعارف کروانے کے حوالے سے جو کام ان کے والد نے فارسی زبان میں کیا تھا وہ اسے نئی ابھرتی ہوئی زبان اردو میں کریں، تاکہ مزید نچلی سطح پر قرآن کا پیغام پہنچ سکے۔ دوسری بات یہ معلوم ہو رہی ہے کہ اس کا نام ''موضح قرآن'' ہے نا کہ ''موضح القرآن'' جیسا کہ بعض جید محققین نے لکھا ہے۔[۱۷] تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اس کی تکمیل ۱۲۰۵ھ میں ہوئی۔ تاہم اس کا آغاز شاہ صاحب نے کب کیا؟ اس بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔

مولانا اخلاق حسین قاسمی نے لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے چالیس سال اکبرآبادی مسجد میں معتکف رہ کر اپنا ترجمہ قرآن مکمل کیا۔[۱۸] مولانا عبدالرشید عراقی کے مطابق یہ ترجمہ قرآن ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء میں شروع کیا اور ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء میں مکمل ہوا۔[۱۹] مولانا محمد عارف عمری کے مطابق اس کی تالیف میں

---

[۱۶] دہلوی، شاہ عبدالقادر، موضح قرآن (مقدمہ)، مطبع احمدی، کلکتہ، ۱۳۰۷ھ، ص ۱

[۱۷] مولوی عبدالرحیم ضیاء سے لے کر مولانا سعود عالم قاسمی تک تقریباً تمام قابل ذکر محققین نے اس کا نام ''موضح القرآن'' لکھا ہے، جو درست نہیں اور اس نام سے تکمیل کی تاریخ نہیں نکلتی۔ درست نام ''موضح قرآن'' ہے جیسا کہ مقدمے میں شاہ صاحب نے خود صراحت فرمائی ہے۔

[۱۸] ملاحظہ ہو: محاسن موضح قرآن، ص ۹۰۔ مولانا نے یہ بات مفتی محمد شفیع کے حوالے سے لکھی ہے لیکن یہ کوئی مستند ماخذ نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے ایک مکتوب میں چالیس سال میں لکھے جانے پر تعجب کا اظہار کیا ہے (ملاحظہ ہو: آزاد، مکاتیب ابوالکلام آزاد، اردو اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۹۷)

[۱۹] عراقی، عبدالرشید، خاندان ولی اللہی دہلوی کی تصنیفی خدمات، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۴

بارہ سال صرف ہوئے۔[۲۰] ان تین آراء کو سامنے رکھیں تو سن تالیف کا آغاز درج ذیل متعین ہوتا ہے:

- مولانا قاسمی کے مطابق ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء
- مولانا عراقی کے مطابق ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء
- مولانا اعظمی کے مطابق ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۹ء

ان جملہ محققین نے اپنے دعوے کی تصدیق کے لیے کوئی ماخذ بیان نہیں کیا ہے، اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ کس کا دعویٰ درست ہے۔ البتہ مولانا اخلاق قاسمی نے چالیس سال معتکف رہ کر ترجمہ کرنے کا جو دعویٰ کیا ہے وہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ''مقالات طریقت'' جیسے مستند ماخذ سے پتہ چلتا ہے کہ ہفتے میں ایک روز یعنی چار شنبے کے دن وہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور اپنی دختر اور دوسرے عزیزوں سے ملاقات کے واسطے اکبر آبادی مسجد سے مکان کو تشریف لاتے اور حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہ کے حضور میں سلام عرض کرتے۔[۲۱] یہ ٹھیک وہ زمانہ ہے جب آپ ''موضح قرآن'' پر کام کررہے تھے۔ یہ بات درست ہے کہ آپ فطرتاً گوشہ نشین تھے لیکن یہ گوشہ نشینی آپ کے سماجی امور میں حائل نہیں تھی۔ بہر حال شاہ صاحب نے ''موضح قرآن'' کے مقدمے میں اپنے کام کا عمومی تعارف یوں کروایا ہے:

- اول یہ کہ اس جگہ ترجمہ لفظ بہ لفظ ضرور نہیں کیونکہ ترکیب ہندی، ترکیب عربی سے بہت بعید ہے۔ اگر بعینہٖ وہ ترکیب رہے تو معنی مفہوم نہ ہوں۔
- دوسرے یہ کہ اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف، تا عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔
- تیسرے یہ کہ ہر چند ہندوستانیوں کو معنی قرآن اس سے آسان ہوئے لیکن ابی (ابھی) استاد سے سند کرنا لازم ہے۔ اول معنی قرآن بغیر سند معتبر نہیں، دوسرے ربط کلام ما قبل و ما بعد پہچاننا اور قطع کلام سے بچنا بغیر استاد نہیں آتا۔
- چوتھے یہ کہ اول فقط قرآن ترجمہ ہوا تھا بعد اسکے لوگوں نے خواہش کی تو بعضے فوائد بی (بھی) متعلق تفسیر داخل کیے۔ اس فائدے کے امتیاز کو صرف ''ف'' نشان رکھا۔

---

[۲۰] عمری، محمد عارف، تذکرہ مفسرین ہند، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ج ۱، ص ۲۲۳

[۲۱] ضیاء، عبدالرحیم، مقالات طریقت، ص ۷۰

- قواعد خط ہندی کہنے میں طول ہے۔ استاد سے معلوم ہوں گے۔ البتہ ہندی میں بعضی چیز لکھتے ہیں کہ فارسی میں نہیں۔ اس سبب سے فارسی خواں اول اٹکتا ہے۔ دو جز دیکھے تو ماہر ہو جاوے۔[۲۲]

''موضح قرآن'' کے محاسن پر مولانا اخلاق حسین قاسمی نے بہت عمدہ کام کیا ہے۔ انہوں نے شاہ صاحب کے ترجمے کا تقابل ما قبل ومابعد کے تراجم سے کر کے شاہ صاحب کے ترجمے کی خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔ نیز اس کے فنی و علمی نکات پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اسی طرح محمد سلیم خالد نے ''شاہ عبدالقادر کے اردو ترجمہ قرآن کا لسانی و ادبی مطالعہ'' کے عنوان سے ۲۰۰۰ء میں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) سے ایم۔ فل کا تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو بعد ازاں طبع بھی ہوا ہے۔

ذیل میں موضح قرآن کے محاسن پر چند نکات پیش کیے جاتے ہیں۔

- مفسرین میں سے ایک بڑی تعداد نے "لعل" کے معنی تعلیل[۲۳] کے لیے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے "لعل" کے معنی کی ایک ایسی تعبیر پیش کی ہے جو تعلیل، تحقیق اور ترجی کے معنوں کو محیط ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب نے "لعل" کا ترجمہ ''شاید'' کیا ہے۔ ایسا انہوں نے اس لیے کیا کہ تعلیل کے مفہوم سے یہ ذہن بنتا کہ رحم وفلاح نتیجہ ہوتا ہے عبادت واطاعت کا، حالانکہ رحم وفلاح خدا کی رضا اور خوشنودی کا ثمرہ ہے۔
- حضرت لوط علیہ السلام کی قوم جس شرمناک فعل بد میں مبتلا تھی، قرآن کریم نے ان کی سزا یہ بیان کی ہے: "فجعلنا عالیھا سافلھا"[۲۴]۔ اس کا ترجمہ دیگر مترجمین کے برعکس شاہ صاحب نے یہ کیا ہے ''پھر کر ڈالی ہم نے وہ بستی اوپر تلے''۔ اردو میں اس شرمناک فعل کو

---

[۲۲] دہلوی، شاہ عبدالقادر، محاسن موضح قرآن، ص ۲-۳۔

[۲۳] تعلیل کا مطلب یہ ہے کہ "لعل" سے اوپر کا مضمون بعد والے مضمون کے لیے علت اور سبب کے درجہ میں ہے۔ مثلاً خدا کی عبادت کرو ''تاکہ'' تم پرہیزگار بن جاؤ، یعنی عبادت کے نتیجے میں تم پرہیزگار بن جاؤ گے۔ چنانچہ تعلیل سے یہ مفہوم معلوم ہو رہا ہے کہ خدا کی عبادت پرہیزگار بننے کے لیے کی جائے حالانکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ عبادت خدا کی رضا کے لیے کی جائے۔ چنانچہ یہ مفہوم محض ''شاید'' کہ لفظ سے ادا ہو سکتا ہے۔ مثلاً: خدا کی عبادت کرو، شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ واللہ اعلم۔

[۲۴] سورۃ الحجر، آیت: ۷۴

''اوپر تلے'' کہتے ہیں۔ شاہ صاحب کا ترجمہ الفاظ قرآن کے عین مطابق ہے نیز اس ترجمہ میں اختصار جامعیت اور معنویت بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔

شاہ صاحب کے ترجمے میں تنوع اور رنگارنگی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک ہی لفظ کا ترجمہ موقع و محل کی مناسبت سے الگ الگ کیا ہے تاہم حقیقی مفہوم ہر جگہ باقی رکھا ہے۔ مثلاً سورۃ الفتح میں ہے ''لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذ یبایعونک''[۲۵]۔ اس آیت کا ترجمہ شاہ صاحب نے یوں کیا ہے: ''اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب ہاتھ ملانے لگے''۔ اس آیت میں شاہ صاحب نے بیعت کا ترجمہ ہاتھ ملانا کیا ہے۔ حالانکہ اکثر مترجمین نے بیعت کا ترجمہ بیعت ہی کیا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے جو ترجمہ کیا ہے اس کی تفہیم عام ہے اور ہر ایک کے سمجھ میں آجاتی ہے۔ تاہم ایک اور آیت میں یہ لفظ یوں آیا ہے: ''فبایعھن واستغفرلھن اللہ''[۲۶] اس آیت کا ترجمہ شاہ صاحب نے یوں کیا ہے ''تو ان (عورتوں) سے اقرار لے اور معافی مانگ ان کے واسطے اللہ سے''۔ اس جگہ شاہ صاحب نے بیعت کا ترجمہ ''اقرار'' کیا ہے کیونکہ اگر اس جگہ بھی پہلا معنی لیا جاتا تو غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ کیا حضور اکرم ﷺ عورتوں سے ہاتھ ملایا کرتے تھے۔

- امی کا معنی عام طور پر مترجمین و مفسرین نے ''ان پڑھ'' کیا ہے۔ لیکن جہاں جہاں قرآن کریم میں یہ لفظ آیا ہے[۲۷] شاہ صاحب نے امی کا ترجمہ امی ہی کیا ہے۔ اور ایک جگہ اس لفظ کی صراحت حاشیے میں کی ہے کہ ''ان پڑھ کہتے تھے عرب کے لوگوں کو کہ ان کے پاس پہلے پیغمبروں کا علم نہ تھا''۔[۲۸] شاہ صاحب کی اس صراحت سے معلوم ہوتا ہے کہ ''امی'' کا لفظ اہل کتاب کے مقابلہ میں بولا گیا ہے اور اسی مفہوم میں نبی کریم ﷺ کو ''امی'' کہا گیا ہے۔

---

[۲۵] سورۃ الفتح، آیت: ۱۸۔

[۲۶] سورۃ الممتحنہ، آیت: ۱۲۔

[۲۷] مثلاً: سورۃ الاعراف: آیت: ۱۵۸، سورۃ آل عمران، آیت: ۲۰، سورہ الجمعۃ، آیت: ۲۔

[۲۸] ملاحظہ ہو: ''وقل للذین اوتوالکتب والامیین'' (سورۃ آل عمران: آیت: ۲۰) کا ترجمہ کیا ہے: ''اور کہہ دے کتاب والوں کو ان پڑھوں کو''۔ اُمی اور اُمیون کی تحقیق پر مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے ''الامیون'' کے عنوان سے فکر و نظر (علی گڑھ)، ۱۹۶۳ء، میں نہایت عمدہ مضمون تحریر کیا ہے، جس میں اس مسئلہ کے ہر پہلو کو صاف کر دیا ہے۔

''امی'' کے لفظ سے عام طور پر تحقیر کا جو معنی اخذ ہوتا ہے شاہ صاحب کی اس توجیہ سے تحقیر کی نفی ہو جاتی ہے۔

بعض مقامات پر شاہ صاحب نے جمہور مفسرین سے الگ راہ اختیار کی ہے مثلاً: "ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم فلا یؤمنوا حتی یروا العذاب الالیم"[۲۹] (اے رب مٹا دے ان کے مال اور سخت کر دے ان کے دل کہ نہ ایمان لاویں جب تک دیکھیں دکھ کی مار)۔ اس پر شاہ صاحب نے یہ حاشیہ لکھا ہے: ''سچے ایمان کی ان سے امید نہ تھی، مگر جب کچھ آفت پڑتی تو جھوٹ زبان سے کہتے کہ اب ہم مانیں گے۔ اس میں عذاب تھم جاتا۔ کام فیصل نہ ہوتا۔ اسی واسطے مانگا کہ یہ جھوٹا ایمان نہ لاویں۔ دل ان کے سخت رہیں تا عذاب پڑ چکے اور کام فیصل ہو''۔[۳۰] اس آیت کا یہ مفہوم محض شاہ صاحب کے ہاں ملتا ہے۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اخلاق حسین قاسمی لکھتے ہیں: ''شاہ صاحب نے جمہور کی تفسیر سے الگ مراد کیوں اختیار کی؟ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کافر کے لیے ایمان سے محروم رکھنے اور کفر پر مرنے کی دعا کرنا جائز نہیں۔ ایسی دعا کرنا منصب رسالت کے خلاف ہے''[۳۱]۔

- ''موضح قرآن'' کے حواشی میں شاہ صاحب نے بعض کمزور روایات وتاویلات بھی پیش کی ہیں۔ مثلاً: "وظن داؤد انما فتناہ"[۳۲] (اور خیال میں آیا داؤد کے ہم نے اس کو جانچا)۔ حضرت داؤد کو کس آزمائش سے جانچنے کا ذکر ہے؟ اس حوالے سے شاہ صاحب نے ہمسایہ کی عورت پر دل آنے والی وہ اسرائیلی روایت ذکر کی ہے جسے محققین نے یکسر مسترد کر دیا ہے[۳۳]۔
- موضح قرآن میں بعض متروک الفاظ بھی ملتے ہیں۔ سب سے پہلے سید عبداللہ لاہوری نے ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء میں موضح قرآن کا جو نسخہ شائع کیا تھا، اس میں مشکل ہندی الفاظ کی فہرست بھی شامل کی تھی، جو ۱۰۳ الفاظ پر مشتمل ہے۔ سید احمد حسن دہلوی نے بھی اس کے

---

[۲۹] سورۃ یونس، آیت: ۸۸

[۳۰] دہلوی، شاہ عبدالقادر، موضح قرآن، ص ۱۷۸

[۳۱] قاسمی، اخلاق حسین، محاسن موضح قرآن، ص ۲۴۲

[۳۲] سورۃ ص، آیت: ۲۴

[۳۳] تفصیل ملاحظہ ہو سیوہاروی، حفظ الرحمن، قصص القرآن، مکتبہ رحمانیہ، ب۔ت۔، ج ۲، ص ۶۲

مشکل الفاظ کی ایک فہرست شائع کی تھی۔

- حضرت شیخ الہند نے ''موضح فرقان'' کے نام سے اس کی تسہیل کی تھی جو دراصل بعض متروک الفاظ کی جگہ مشہور الفاظ کے اضافوں پر مشتمل ہے۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے اس میں ۳۵۰ متروک الفاظ کی نشاندہی کی ہے۔
- ''موضح قرآن'' کا سب سے قدیم قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ (حیدرآباد دکن) کے کتب خانے میں ہے۔ یہ ابتدائی پندرہ پارے ہیں، جس کے ۲۷۰ صفحات ہیں۔ ترقیمہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۲۳۴ھ/۱۸۰۹ء میں لکھا گیا۔ کاتب کا نام محمد شریف الدین حسین درج ہے۔ گویا یہ نسخہ شاہ صاحب کی وفات سے چھ سال پہلے لکھا گیا اور اس وقت شاہ عبدالعزیز بھی حیات تھے۔
- اس کا ایک قلمی نسخہ جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔
- عربی/فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (ٹونک) کے کتب خانے میں اس کے چھ نسخے ہیں۔ پہلا نسخہ ابتدائی پندرہ پاروں اور دوسرا نسخہ آخری پندرہ پاروں پر مشتمل ہے۔ اس کے کاتب مولوی سراج الدین ہیں۔ تیسرا نسخہ محض سورۃ البقرہ پر مشتمل ہے۔ چوتھا نسخہ ربع اول پر مشتمل اور آخر سے ناقص ہے۔ پانچواں نسخہ محض تیس سورتوں کے ترجمے پر مشتمل ہے اور اس میں تفسیر عزیزی کا کچھ حصہ بھی شامل ہے۔ چھٹا نسخہ کرم خوردہ اور ناقص الطرفین ہے۔
- اس کا ایک قلمی نسخہ قومی عجائب گھر (کراچی) کے کتب خانے میں موجود ہے۔
- اسی طرح ایک اور قلمی نسخہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے ذاتی کتب خانے میں بھی ہے۔ یہ دونوں نسخے کرم خوردہ اور ناقص ہیں۔
- رضا لائبریری (رام پور) میں اس کے چھ قلمی نسخے موجود ہیں۔ پہلا نسخہ ۱۲۳۰ھ/۱۸۸۰ء کا ہے اور اس کے کاتب کا نام درج نہیں۔ اس کے صفحات ۵۱۶ ہیں۔ دوسرا نسخہ ۴۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ تیسرا نسخہ ۵۰۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ چوتھا نسخہ محمد رحیم اللہ رام پوری کا لکھا ہوا ہے اور یہ قلمی نسخہ ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء میں لکھا گیا ہے، یہ نسخہ دو جلدوں پر مشتمل ہے اور شاہ ولی اللہ کے فارسی ترجمے کے نیچے لکھا گیا ہے۔ پانچواں نسخہ بھی اسی کاتب کا لکھا ہوا ہے، جو ۱۲۴۳ھ/۱۸۲۷ء میں نواب احمد علی خان بہادر کی فرمائش پر لکھا گیا۔ چھٹا نسخہ کرم خوردہ

اور آخر سے ناقص ہے۔

- انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں بھی اس کے چھ قلمی نسخوں کا پتہ چلتا ہے۔
- ادارہ ادبیات اردو (حیدرآباد، دکن) کے کتب خانے میں بھی اس کا ایک قلمی نسخہ پایا جاتا ہے، جو نامکمل و ناقص ہے۔

مطبوعہ نسخوں میں سب سے قدیم نسخہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء کا ہے جسے مطبع احمدی (کلکتہ) نے طبع کیا تھا۔ اس نسخے میں سید عبداللہ لاہوری نے کچھ ردوبدل بھی کیا، جس پر مولانا اخلاق حسین قاسمی نے سخت نکیر کی ہے اور اس نسخے کو مستند تسلیم نہیں کیا۔[۳۳] الہ آباد سے اس کی ایک اشاعت ۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء میں ہوئی، جس کی خاص بات یہ ہے کہ اس پر ایک عیسائی مصنف کے حواشی ہیں۔ مولانا قاسمی نے ''موضح قرآن'' کے ۱۷ مطبوعہ نسخوں کی فہرست دی ہے۔[۳۴] جبکہ مشفق خواجہ نے ''جائزہ مخطوطات اردو'' میں اس کی ۱۳۵ اشاعتوں کی فہرست دی ہے۔[۳۵]

ترتیب و تسہیل کے اعتبار سے ''موضح قرآن'' پر سب سے عمدہ کام شیخ الہند مولانا محمود حسن (م: ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کا ہے، جو ''موضح فرقان'' کے نام سے ہے۔ جبکہ تحقیق واسناد کے اعتبار سے مولانا اخلاق حسین قاسمی کا کام ہے جو ''مستند موضح قرآن'' کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔ انڈیا آفس لائبریری کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ ''موضح قرآن'' تامل، پنجابی، ہندی اور پشتو زبان میں منتقل ہوئی ہے۔ اس فہرست میں ایک انگریز مصنف کی تصنیف کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو شاہ صاحب کے ترجمے اور فوائد کے انڈیکس پر مشتمل ہے۔ یہ لدھیانہ سے ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء میں طبع ہوئی تھی۔

---

[۳۳] قاسمی، اخلاق حسین، محاسن موضح قرآن، ص ۸۹-۸۶

[۳۴] مرجع سابق، ص ۵۸۰-۵۷۵۔

[۳۵] مشفق خواجہ، جائزہ مخطوطات اردو، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ج ۱، ص ۶۲-۶۰۔

افاضات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی

اور علمائے جنوب

ڈاکٹر راہی فدائی

na_qasmi@yahoo.com

خالق کائنات کی یہ حکمت بالغہ ہے کہ اس نے انواع واقسام علوم فنون کو ایک ہی شخصیت اور ایک ہی ذات میں مرکوز و محدود نہیں فرمایا بلکہ اس کی یہ سنت و عادت جاریہ ہے کہ اس نے علم و عرفان کے مظاہر وعکوس تمام کائنات میں جابجا پھیلا دیے ہیں تا کہ کوئی اس زعم باطل میں مبتلا نہ رہے کہ وہی جامع کمالات و مرکز حسنات ہے۔ اللہ رب العزت نے یہ خصوصیت و انفرادیت صرف اور صرف اپنے حبیب پاک، سرور کونین، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین، شفیع المذنبین اور غیاث المستغثین کے منصب اعلیٰ وارفع پر فائز فرمایا۔ چنانچہ آپؐ کی مدح وثنا میں کہا گیا ہے:

حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا جن وانس میں سے کسی بھی فرد واحد میں تمام صفات کمالیہ کا بیک وقت جمع ہونا ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند قدوس نے "لکل فن رجال" کے مصداق نو بہ نو اہداف کے لئے مختلف اشخاص کا انتخاب فرمایا اور انہیں اسی کام کے لئے مختص کر دیا۔ یہی ''سنت اللہ'' ہے۔ اس دار العمل میں یہی اصول جاری وساری رہے گا۔

ہندوستان کے شمالی سرے پر شہر ''دہلی'' اور ہند کے انتہائی جنوب میں قصبہ ''آتور'' (تامل ناڈو) واقع ہے۔ کس کو پتہ تھا کہ دو صدی پیشتر "بعدالمشرقین" کے ان اہل علم واصحاب کمال کو علمی طور پر ایک دوسرے کے قریب کرنے اور انہیں سلک فیضان و عرفان میں پرونے کی سعی مشکور کرنے والی شخصیت جنوب بعید میں پیدا ہوگی۔ قدرت خداوندی کی کرشمہ سازی ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) کے لخت جگر و نور نظر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (۱۱۵۹ھ-۱۲۳۹ھ) کے افکار وافاضات کی ترسیل وابلاغ کے لئے خدائے تعالیٰ نے خانوادۂ حضرت شاہ مدار آتوری (متوفی ۱۱۵۵ھ) کے چشم وچراغ حضرت علامہ حافظ شیخ عبدالقادر آتوری (متوفی ۱۱۵۵ھ تقریباً) ابن

حضرت شاہ غلام محی الدین قادری (متوفی ۱۲۲۰ھ) کو منتخب فرمایا۔

شیخ عبدالقادر کی ولادت ۱۵؍ربیع الآخر ۱۱۹۸ھ مطابق ۱۷۸۳ء بمقام آتور ہوئی۔ آتور صوبہ تامل ناڈو کے ضلع کرور (Karur) کا ایک مردم خیز قصبہ ہے، جہاں سے بہت سارے علما و فضلا اور صوفیا و فقہا کا خمیر اٹھا، انہی میں سے حضرت شاہ مدار کا خاندان بھی ہے۔ اس قصبہ آتور کو مدورائی کے قلعدار ''متونائک'' نے حضرت شاہ مدار علیہ الرحمہ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا تھا[۱]۔

شیخ عبدالقادر آتوری کی ابتدائی تعلیم آپ کے والد ماجد شاہ غلام محی الدین قادری کے زیر سرپرستی ہوئی بعد ازاں شاہ قادری نے آپ کو جنوب کے مشہور و مایہ ناز عالم و فاضل، صوفی کامل اور عربی کے شاعر و ادیب علامہ شیخ عبدالقادر تکیہ صاحب (۱۱۹۲ھ۔۱۲۶۷ھ) کی بارگاہ میں ''کیلا کرائی'' (Kilakarai) تامل ناڈو روانہ فرمایا، جہاں آپ نے مطولات کتب معقول و منقول کی تعلیم حاصل کی۔ کیلا کرائی میں علوم ظاہری سے فراغت کے بعد آپ نے وطن عزیز کا رخ کیا اور آتور میں والد کی خدمت میں رہ کر علوم باطنی کے حصول میں مصروف ہوگئے' یہاں تک کہ ۱۲۲۰ھ میں آپ کے پدر بزرگوار کا وصال ہوگیا۔ پھر آپ نے آتور اور اس کے اطراف و اکناف کے علاقوں میں اشاعت دین و اصلاح مسلمین کا فریضہ چند سالوں تک ادا کیا۔ بعد ازاں آپ کو اپنے باطن میں اک گونا تشنگی کا احساس ہونے لگا اور ایک طرح کا اضطراب محسوس ہوا اور جب اس کیفیت میں شدت آگئی تو آپ نے صوبہ کرناٹک کے اس وقت کے دارالخلافہ شہر ''مدراس'' کے لئے رخت سفر باندھا۔

اس دور میں مدراس علوم و فنون کا ''معدن جواہر'' تھا۔ شہر میں علامہ قاضی محمد ارتضیٰ علی خاں بہادر صفوی خوشنود (ولادت ۱۱۹۸ھ وفات ۱۲۷۰ھ)[۲] کا طوطی بول رہا تھا۔ قاضی موصوف کو والی کرناٹک

---

[۱] راہی فدائی ڈاکٹر، ''جنوب کے اصحاب کمال''، الانصار پبلی کیشنز، حیدر آباد، مطبوعہ ۲۰۱۹ء۔ جلد ۱، ص ۴۲۶

[۲] علامہ قاضی محمد ارتضیٰ علی فاروقی صفوی کا وصال بتاریخ ۷/ شعبان ۱۲۷۰ھ بروز جمعہ حج بیت اللہ سے واپسی کے دوران پانی کے جہاز میں ہوا۔ حسب روایت نماز جنازہ کے بعد نعش مبارک سمندر کی موجوں کے حوالے کردی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نعش کو بہ سلامت ''حاقة الحديدة'' پہنچایا، جہاں لوگوں نے آپ کی تدفین بعقیدت و احترام کردی: بحوالہ "العرائس الرضية على النفائس الارتضيه" مولانا محمد ویلتوری، کیرالا۔ مطبوعہ مکتبہ بدریہ، کونا کل، مالاپورم، کیرالا۔ ۱۴۰۸ھ ص ۳۔ علامہ ارتضیٰ علی خاں کے والد ماجد قاضی مصطفی

امیر الہند محمد علی والا جاہ (متوفی ۱۲۱۰ھ) کے ساتھ قرابت داری تھی۔ دونوں نسباً فاروقی تھے اور دونوں کا زاد بوم قصبہ ''گوپامئو'' تھا۔ قاضی ارتضیٰ علی کے والد ماجد مولانا قاضی مصطفی علی خاں فاروقی خوشدل (متوفی ۱۲۳۴ھ) نواب والا جاہ کے عہد (۱۱۶۴ھ تا ۱۲۱۰ھ) دوران ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں مدراس تشریف لائے اور ۱۲۱۶ھ میں شہر ترچناپلی کے قاضی مقرر کئے گئے[۳]۔ پھر چند سال بعد صوبہ مدراس کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز ہوئے۔ اسی دوران قاضی مصطفی علی خاں نے اپنے لائق و فائق فرزند کو مدراس بلالیا، چنانچہ قاضی محمد ارتضیٰ علی خاں اپنے وطن مالوف گوپامئو سے سنہ ۱۲۲۵ھ میں مدراس تشریف لائے اور والد کی خواہش پر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ قاضی ارتضیٰ علی گوپامئوی علامہ حیدر علی سندیلی اور علامہ محمد ابراہیم ملیباری کے شاگرد رشید تھے[۴]۔ یہ دونوں اساتذۂ کرام علوم معقول و منقول کے ماہر تھے۔ ان متبحر علماء کی تربیت نے قاضی موصوف کو تعلیم و تدریس کا ملکہ عطا کردیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا حلقہ درس سارے شہر میں معروف و مشہور ہوگیا۔

شیخ عبدالقادر آتوری نے قاضی ارتضیٰ علی فاروقی کی شہرت سنی تو بڑے اشتیاق کے ساتھ قاضی صاحب کے حلقہ درس میں شمولیت اختیار کرلی۔ آپ کی خداداد صلاحیتوں، ذکاوت و فراست اور طبعی شرافت و نجابت نے استاد محترم کو بہت متاثر کیا۔ چونکہ استاد و شاگرد ہم مزاج و ہم منہاج ہونے کے علاوہ ہم عمر بھی تھے (دونوں کی سنہ ولادت ۱۱۹۸ھ کی ہے) اس لئے یہ رشتہ بہت جلد دوستی و قدر دانی میں بدل گیا اور یہ تعلق خاطر اور ربط باہمی شیخ آتوری کی وفات حسرت آیات بتاریخ ۱۹؍ محرم الحرام ۱۲۵۱ھ تک باقی رہا۔

اس دوران قاضی ارتضیٰ علی سے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی مختصر عربی تصنیف ''الرسالۃ العزیزیہ'' کی مبسوط شرح بنام ''النفائس الارتضیۃ'' لکھی۔ آپ نے یہ شرح شاہ عبدالعزیز کی زندگی میں رقم

علی خاں کا مزار شہر مدراس کے علاقہ ''بیارس'' میں مسجد معمور کے صحن میں داخلی دروازے کے بائیں سمت اپنے والد کی تربت کے پہلو میں موجود ہے۔ راقم الحروف (راہی فدائی) نے اس کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے۔

[۳] محمد غوث خاں اعظم نواب والا جاہ (متوفی ۱۲۷۳ھ) تذکرہ ''گلزار اعظم'' مطبوعہ مطبع سرکاری، مدراس سنہ ۱۲۷۲ھ ص ۱۶۹

[۴] ماخذ سابق، ص ۱۷۵

کی تھی۔ قاضی موصوف نے النفائس الارتضیۃ شرح الرسالۃ العزیزیۃ' اپنے صدیق محترم و تلمیذ مکرم کو مطالعہ کے لئے پیش کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز کا بھرپور تعارف کرایا، شیخ آتوری نے شرح کو بہت پسند کیا اور کتاب کی خوب تعریف کرتے ہوئے اس کی ایک عمدہ نقل اپنے دست مبارک سے ۱۲۴۸ھ میں تیار کی جو آج تک آپ کے فرزند ارجمند حضرت علامہ شاہ عبدالوہاب قادریؒ خلیفہ حضرت قطب ویلورؒ و حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے قائم کردہ مدرسہ جامعہ باقیات الصالحات، ویلور (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے کتب خانے کی زینت بڑھا رہی ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ قاضی ارتضٰی علی خان فاروقی نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی فارسی تفسیر علامہ شیخ عبدالقادر آتوری کے حوالے کرتے ہوئے یہ خواہش ظاہر کی ہو کہ "تفسیر عزیزی" کا ترجمہ عربی زبان میں کردیں تاکہ جنوب بعید کے وہ علاقے جہاں کے اہل علم و اصحاب فضل فارسی زبان سے یکسر ناواقف ہیں، انہیں شاہ عبدالعزیز کے افکار و خیالات اور ارشادات و افاضات سے متمتع ہونے کا زریں موقع میسر آئے۔ شیخ آتوری نے "تفسیر عزیزی" کا مطالعہ فرمایا تو شاہ صاحب کے افکار عالیہ سے بہت متاثر ہوئے اور آپ نے عزم کرلیا کہ اس تفسیر کی تعریب ان شاءاللہ کردی جائے گی۔ چنانچہ آپ نے سنہ ۱۲۴۹ھ میں تفسیری عزیزی کا عربی ترجمہ "التعریب القادری للتفسیر العزیزی" کے نام سے کیا[۵]۔ علاوہ ازیں کلام پاک کے آخری دو جز پر مشتمل اس فارسی تفسیر میں مضمون کی مناسبت سے جہاں جہاں فارسی اشعار پیش کئے گئے ہیں، وہاں شیخ آتوری نے ان اشعار کا عربی ترجمہ منظوم کیا جس سے آپ کے شعری ذوق و موزونی طبع کے اظہار کے ساتھ دونوں زبانوں میں آپ کے تبحر علمی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ آپ نے رقم کیا:

وانا ایضا اعرّب الابیات الفارسیۃ الی العربیۃ واترکہ بلا تغییر و تفسیر واشیر، الیٰ الابیات العربیۃ بالفظ یدلّ علی التعریب من النثر والنظم مسمٰی بالتعریب القادری للتفسیر العزیزی، جعلتہٗ لِلہ خالصاً لوجہ الکریم بمنۃ العمیم وذخیرً الی عندہ یوم العظیم بفیضہ المقیم وبہ التوفیق ابتدأت فی بلدۃ ایلور حماہ اللہ من افات الدھور بالقریب بتاریخ خمسۃ عشر من شھر المحرم سنۃ تسع واربعین ومأتین بعد مضیی الالف من الھجرۃ النبویۃ المحمدیۃ المصطفویۃ علی صاحبھا افضل الصلوۃ والتحیۃ وعلی آلہ واصحابہ۔۔۔[۶]

---

[۵] راہی فدائی ڈاکٹر، جنوب کے اصحاب کمال (جلد دوم) الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، مطبوعہ ۲۰۱۹ء ص ۴۳۴

[۶] ماخذ سابق، ص ۴۳۵

شیخ آتوری نے یہ کارنامہ شہر ویلور (تامل ناڈو) میں اپنے طویل قیام کے دوران انجام دیا تھا، جب کہ آپ نے اپنے پیر و مرشد حضرت علامہ سید شاہ ابوالحسن محوی ویلوریؒ (۱۱۸۶ھ تا ۱۲۴۳ھ) کے حکم پر متاہل ہونے کے باوجود حضرت محوی کے ایک اور خلیفہ مولانا محمد امین صاحب قادری (متوفی ۱۲۴۸ھ) کی صاحبزادی حضرت فاطمہ سے پینتالیس (۴۵) سال کی عمر میں بمقام ویلور دوسرا نکاح کیا، جن کے بطنِ پاک سے شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری کی ولادت سن ۱۲۴۷ھ میں ہوئی۔ شیخ آتوری قادری کو "التعریب القادری" تحریر کرتے ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے اس قدر عقیدت و محبت ہوگئی کہ آپ نے اپنے دوسرے صاحبزادے کا نام اظہارِ محبت کے طور پر "عبدالعزیز" رکھا۔ مگر افسوس وہ فرزند بعہد طفلی سن ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں واصل بحق ہوگئے۔[7]

علامہ شیخ عبدالقادر قادری آتوری علیہ الرحمہ نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار "التعریب القادری للتفسیر العزیزی" کی ابتدا میں حمد و صلوۃ کے بعد کیا ہے اور شاہ صاحب کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا:

> فیقول العبد المذنب المتلوث بجابات الآئیۃ والغیریۃ الراجی رحمۃ اللہ الباری حافظ عبدالقادر لآتوری المدھوری طھر اللہ عن الحجب والعیوب بلطفہ الخفی المطلوب وعافاہ فی بدنہ وسمعہ و بصرہ بفضل المرغوب، لمّا کان تفسیر الفاتحہ ام الکتاب لمولانا العالم العلامۃ والکامل الفھامہ والحبرالنحریر فی التقریروالتحریر فرید دھرہ وحید عصرہٖ البحر الزاخر الالمعی الماھر نقاد الحدیث النبوی عبدالعزیز الدھلوی بن ولی اللہ المحدث وھو ابن الشیخ عبدالرحیم الدھلوی قدس اللہ اسرارھم و نفعنا بعلومھم وبرکاتھم۔۔مع تفسیر الجزئین الاخیرین من القرآن المجید فارسیاً شاقاً علی اھل العربیۃ[8]

" التعریب القادری" کے نقول جنوبی ہند کے طول و عرض میں پھیل گئیں، جس سے فارسی سے نابلد ان علاقوں میں شاہ عبدالعزیز کے افکار و افاضات کی اشاعت خوب ہوئی، خصوصاً تامل ناڈو، کیرل، سیلون،

---

[7] یہ تاریخ حضرت بانی مدرسہ باقیات صالحات ویلور کی ذاتی بیاض سے ماخوذ ہے۔ یہ بیاض استاذ محترم حضرت علامہ رئیس الاسلام، سابق مدرس مدرسۂ باقیات کی ملکیت تھی، جو بانی مدرسہ حضرت شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری کے فرزند خان بہادر علامہ قاری ضیاء الدین محمد ویلوری کے حقیقی پوتے تھے۔

[8] "التعریب القادری للتفسیر العزیزی" مخطوطہ کی شکل میں مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے کتب خانے کا مخزونہ ہے۔ جس کے ابتدائی چار صفحات کی زیروکس کاپی راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

انڈونیشیا وغیرہ مقاموں اور ملکوں کی مسلم آبادیاں شیخ آتوری کی وجہ سے فیضان عزیزی سے بہرہ ور ہوئیں۔ "التعریب القادری" کا مطبوعہ نسخہ تاحال دستیاب نہ ہوسکا، البتہ ایک صدی پیشتر اس معرکہ آرا تفسیر کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے کی سعی کی گئی، جس کی اطلاع مدرسہ باقیات الصالحات، ویلور (تامل ناڈو) کے ناظر سوم و مہتمم حضرت علامہ شاہ عبدالرحیم آتوریؒ (متوفی ۱۳۶۷ھ) خلیفہ مولانا خلیل احمد انبیٹھویؒ (متوفی ۱۳۴۶ھ) کے مکتوب سے ہوتی ہے۔ علامہ عبدالرحیم آتوری مدرسہ باقیات کے ناظر دوم و مہتمم حضرت علامہ ابوالفضل ضیاء الدین محمد (متوفی ۱۳۶۰ھ) ابن بانئ باقیات شمس العلما شاہ عبدالوہاب قادری (متوفی ۱۳۳۷ھ) کے داماد اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی (متوفی ۱۳۳۹ھ) کے شاگرد رشید تھے۔ دارالعلوم سے شاہ عبدالرحیم کی فراغت سنہ ۱۳۳۰ھ میں ہوئی تھی۔ وہ سنہ ۱۳۳۱ھ میں مدرسہ باقیات کے شعبہ تدریس سے وابستہ ہوگئے۔ بعد ازاں آپ کو مدرسہ کی نظارت و اہتمام کے اعلیٰ منصب پر فائز کیا گیا[۹]۔ آپ نے ایک مکتوب بنام مولانا حبیب الرحمن صاحب (متوفی ۱۳۴۸ھ) نائب مہتمم دارالعلوم، دیوبند و مصنف رحمۃ للعالمین، ۲، ذوالحجہ ۱۳۳۷ھ کو تحریر فرمایا تھا جس کا متن حسب ذیل ہے:

جناب عالی حضرت مخدومنا المکرم مولانا مہتمم صاحب مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ مع تقدیم آداب و قدم بوسی بفضلہ تعالیٰ بندہ آنجناب کے سرفراز نامے سے مشرف ہوکر مدت ہوگئی، مشتاق ہے کہ سرفراز نامے کی شرف یابی سے محظوظ فرماویں، اگرچیکہ آنجناب و دیگر حضرات کرام کی حالت بوساطت طلبہ مدراسی جو مدرسہ دیوبند میں سرسال سے طالب علمی کررہے ہیں، معلوم کرلیا کرتا ہوں، تاہم بلا وساطت آنجناب و دیگر حضرات کی خیریت معلوم کرلینے کی ازحد تمنا ہے۔ ایک طالب علم حبیب محمد سلونی جو دیوبند سے یہاں آئے، ان سے سنا کہ بڑے مہتمم مولانا صاحب کا مزاج علیل ہے، جس کو سن کے بندہ کو فکر ہوئی۔ خدا کرے کہ ابھی تلک خداوند تعالیٰ نے انہیں صحت عطا فرمائی ہو۔ حضرت مولانا موصوف کی خیریت تحریر فرمانے کے ساتھ اپنی بھی خیریت تحریر کیجئے۔ حضرت بڑے مولانا صاحب کیا وجہ ابھی تلک مالٹا سے وطن تشریف نہ لائے۔ خبر تو یوں ہے کہ مولانا نظر بندی سے چھوٹ گئے۔ حضرت مولانا کی طرف سے دیوبند کو تو خط آیا ہوگا۔ خبر واقعی سے امید کہ بندہ کو تسکین و اطمینان کیا جائے۔

---

[۹] راہی فدائی ڈاکٹر، ''ادبیات ویلور''، الانصار پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۲۰۱۸ء ص ۳۳۸

میرے جد امجد مولانا عبدالوہاب صاحب مرحوم کے والد مکرم مولانا حافظ عبدالقادر صاحب نے مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کی سورۂ فاتحہ کی تفسیر کو معرب کیا تھا۔ وہ قلمی کتاب کتب خانے میں دستیاب ہوئی۔ چونکہ وہ تفسیر بہت عمدہ ہے اس لئے مولانا مہتمم مدرسہ باقیات الصالحات (علامہ قاری ابوالفضل ضیاء الدین محمدؒ) نے اس کو طبع کرنے کا خیال فرمارہے ہیں۔ آیا مطبع قاسمی میں اجرت پر کتاب طبع کرائی جاتی ہیں۔ اگر ہو تو اس مطبع میں طبع کرنے کا خیال ہے۔ اجرت وغیرہ سے اطلاع دی جائے۔

بحمد للہ مدرسہ باقیات الصالحات اچھی حالت پر جاری ہے۔ سلسلہ نظامیہ کی سب کتب جاری ہیں، اگرچیکہ میرے جد امجد صاحب مرحوم مولانا اخیر زمانہ میں معقولات کی اجازت نہیں دیتے تھے، اور زیادہ تر دینیات فقہ، تفسیر، تصوف مثلاً احیاء العلوم وغیرہ کتبوں کے پڑھنے پر زور دیتے تھے، مگر اب مصلحت زمانہ سے سب فنون معقول جاری کردئے گئے۔ یہاں پر نصاب تحصیل علم دو مقرر کئے گئے ہیں۔ ایک تحصیل کا نام مختصر جس کے سات سال دوسرے کا نام مطول جس کے لئے نو سال۔ تحصیل مطول کی کتب پڑھنے والوں کو دو سال تک دس دس روپے ماہواری وظیفہ مقرر ہے۔ علاوہ خوراک کے، طلبۃ العلوم ابھی تک سو (۱۰۰) تک رہے تھے، دو سو تک لینے کا خیال ہے۔ امسال بندہ کے پاس مختصر المعانی، تفسیر جلالین، مقامات حریری، در مختار، قطبی میر، نفائس ارتضیہ جاری ہیں۔ بندہ کی تنخواہ ۳۶ ہیں۔ دعا فرمایئے کہ علم و عمل میں ترقی نصیب ہو۔ بندہ کا ایک سالہ لڑکا محمد طیب نامی ہے، دعا فرمادیں کہ عمر میں اس کی برکت ہو۔ بارش نہیں ہے، حرارت زیادہ ہے۔ نہ معلوم وہاں کی کیا حالت ہے۔ سنا تھا کہ مولانا شبیر احمد صاحب حج کو تشریف لے گئے ہوئے ہیں۔ وہاں سے خیریت کا خط تو آیا ہوگا۔ بندہ کی طرف سے جناب حضرت بڑے مہتمم صاحب کو آداب و قدم بوسی معروض خدمت ہے۔ مدرسہ دیوبند کی نئی حالت اگر کوئی ہو تو بھی اطلاع دیں۔ گستاخی معاف، زیادہ کیا عرض کروں۔ والسلام علیکم و علی من لدنکم فقط الراقم احقر۔۔۔ خادم عبدالرحیم مدراسی از ویلور۔ مدرسہ باقیات الصالحات۔ ۲؍ ذوالحجہ بروز جمعہ ۷۳ھ[10]

---

[10] اس خط کا عکس راقم الحروف (راہی فدائی) کو عزیز محترم مولانا محمد سلطان باقوی نے واٹس اپ کے ذریعہ فراہم کیا ہے۔ راقم مولانا سلطان باقوی کا بے حد شکر گذار ہے۔ راقم نے اس مکتوب میں ''او قاف تحریر'' کا اضافہ کیا ہے تاکہ قارئین کے مطالعہ میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

علامہ شیخ عبدالقادر قادری آتوری کی یہ مخلصانہ و مخیرانہ تفسیری کاوش بارآور ثابت ہوئی۔ جنوب میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے توسط سے شاہ ولی اللہ محدث کے علمی افاضات کا خوب چرچا ہونے لگا اور شاہ صاحب کے آرا پر مکالموں اور مباحثوں کا ایک سلسلہ اہل علم میں چل پڑا۔ یہ سب کچھ شیخ آتوری کے عربی ترجمہ کے بدولت ہوا۔ یہ اس لئے کہ جنوب بعید کی مسلم آبادیوں کو صدیوں سے عرب اقوام کی صحبتیں میسر آئیں جس کی وجہ سے یہاں عربی زبان گویا ان کی مادری زبان بن گئی، اور وہاں کے علما و فضلا اپنی تخلیقات نظم و نثر عربی ہی میں پیش کرتے رہے۔ شیخ آتوری نے "التعریب القادری للتفسیر العزیزی" کے ذریعہ جنوب کے مسلم معاشرے کو بہت متاثر کیا جس میں عوام کے علاوہ خواص کا ایک بڑا طبقہ بھی شامل ہے۔ حضرت علامہ شاہ عبدالعزیز کی دیگر تصانیف کے مطالعے کی طرف راغب ہونے لگے۔ بعض اہل علم نے شاہ صاحب کی دوسری فارسی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ چنانچہ مدراس کے ایک متبحر عالم اور ذہین وطباع فاضل سراج العلما غلام محمد سعید اسلمی (متوفی ۱۲۷۲ھ) تلمیذ بحرالعلوم علامہ عبدالعلی لکھنوی ثم مدراسی (متوفی ۱۲۲۵ھ) نے شاہ صاحب کی رد شیعیت میں تحریر کردہ معرکہ آرا تصنیف "تحفۂ اثنا عشریہ" (مرقومہ ۱۲۱۵ھ) کا عربی ترجمہ "الترجمۃ العبقریۃ والصولۃ الحیدریۃ" کے عنوان سے سنہ ۱۲۲۷ھ مطابق ۱۸۱۲ء میں کیا جس کے مقدمے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کتاب "تحفۂ اثنا عشریہ" (فارسی) میں حشو وزوائد موجود ہیں مگر مترجم نے ایمان داری سے کام لیتے ہوئے ہو بہو ترجمہ کر دیا ہے۔ چنانچہ علامہ اسلمیؒ رقم طراز ہیں:

> واترجم الکتاب بالفاظہ و عباراتہ لا بمضامینہ الملخصۃ وان کانت اسھل بمراعاۃ القواعد العربیہ ولکن لما کان فی الکتاب کثیر من حشو مستغنی عنہ واطناب بلاطایل و تکرار فی اکثر مواضعہ وما استطیع ان احذفھا کلھا مخالفۃ من العدل' لا جرم ان الامور المذکورۃ تدخل فی الترجمۃ ایضا۔۔۔[۱۱]

شیخ آتوری اپنے شیخ زادے حضرت علامہ سید شاہ عبداللطیف نقوی ویلوری معروف بہ قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) ابن شیخ الشیوخ حضرت محویؒ کو وقتاً فوقتاً مفید کتب و رسائل ارسال فرماتے رہتے تھے۔ چنانچہ بتاریخ ۲۷، صفر المظفر ۱۲۴۸ھ آپ نے تین رسالے "استجاب الدعا"، "قصیدۃ البردۃ" اور "شرف الانعام" حضرت قطب ویلور کی خدمت میں مدراس سے ویلور روانہ فرمایا تھا جس کی اطلاع آپ

---

[۱۱] "جنوب کے اصحاب کمال"، (جلد دوم) ص ۴۴۲

نے اپنی تحریر کے ذریعہ دی تھی"[۱۲]۔ اس طرح دونوں بزرگوں میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ یہ قرین قیاس ہے کہ حضرت قطب ویلور سے مراسلت کے دوران شیخ آتوری نے حضرت شاہ عبدالعزیز کی تعریف و توصیف کی ہو، جس کی وجہ سے حضرت قطب ویلور شاہ صاحب کے اس قدر معتقد ہوگئے کہ شاہ صاحب کی گرانقدر تصنیف "تحفۂ اثنا عشریہ" کا عربی ترجمہ علامہ اسلمیؔ مدراسی کی طرح آپ نے بھی کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ اپنے پہلے سفر حج وزیارت کے دوران ۱۲۶۰ھ سے ۱۲۶۲ھ تک مکہ مکرمہ میں قیام پذیر تھے اور سلطنت عثمانیہ کے گورنر شریف مکہ کے اصرار پر اس ترجمہ کو سلطان کی خدمت میں روانہ فرمایا تھا[۱۳]۔ جس سے سلطان بہت متاثر ہوئے اور آپ کو بارگاہ سلطانی میں تشریف لانے کی دعوت دی مگر آپ نے معذرت کرلی۔

شیخ آتوری کے علمی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور بڑا وقیع ہے۔ یہی سبب ہے کہ آپ کے صاحبزادے شمس العلماء شاہ عبدالوہاب قادری نے اپنے قائم کردہ مدرسے کے نصاب تعلیم میں شاہ عبدالعزیز کے رسالے اور اس کی شرح "النفائس الارتضیہ" کو داخل کیا جو تاحال نصاب کا حصہ ہے، اور مدرسہ باقیات کی پیروی میں جنوبی ہند کے تمام مدارس عربیہ دینیہ میں شاہ صاحب کی کتاب باقاعدہ پڑھائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں شاہ عبدالوہاب نے اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی عقیدت میں آپ کے مشہور شاگرد صوفی صافی حضرت شاہ فضل رحمن گنج مرادآبادی (متوفی ۱۳۱۵ھ) کے دست حق پرست پر بیعت کرتے ہوئے خرقہ خلافت زیب تن فرمایا، اور اپنے شیخ فضلِ رحمن سے اپنے مدرسہ کی ترقی وترویج کے لئے دعا کی درخواست کی۔ حضرت شیخ نے آپ کو دعاؤں سے نوازا۔[۱۴]

---

[۱۲] ان تینوں رسائل کے مخطوطے مدرسہ باقیات صالحات، کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور ان پر شیخ آتوری کی تحریر بھی موجود ہے۔

[۱۳] جنوب کے اصحاب کمال (جلد دوم) ص ۴۴۱

[۱۴] ماخذ سابق، ص ۴۴۳

کتاب ''ہندوستان اسلام کے سایہ میں''

ایک تعارف

محمد عمیر الصدیق ندوی

یہ ۴۵ءیا۴۶ءکی بات ہے،ایک نوجوان جس نے تازہ تازہ دیوبند کی سند عالمیت حاصل کی تھی۔بھوپال کے مدرسہ احمدیہ میں تدریس کی خدمت کے لیے امیدوار ہوا۔انتخاب کرنے والی شخصیت خود زمانہ میں انتخاب تھی۔استاذ الکل، سید الطائفہ جیسے خطابوں کی حامل تھی، جس کی پہچان علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد کے طور پر تھی۔جس نے اردو ہی نہیں پورے فن تاریخ کو ایک نئی جہت عطا کی تھی۔اس شخصیت نے نوجوان امیدوار کے علم و مطالعہ سے خوش ہو کر کہا کہ ''مولوی صاحب میں نے آپ کو آج سے مورخ بنا دیا۔مورخ بننے والے طالب علم کا نام وجدی الحسینی تھا اور مورخ بنانے والے مولانا سید سلیمان ندوی تھے۔

اس کے بعد وقت نے وجدی الحسینی کے وجود کو تراش کر ایسا علامہ قاضی سید عابد وجدی الحسینی بنادیا کہ خود ان کے دیرینہ رفیق ان کو اس نگاہ سے دیکھنے لگے جہاں وہ باطنی پاکیزگی کا ایک حسین پر تو نظر آتے تو دوسری طرف ان کے ارد گرد علم و فضل کی وجاہت کا ہالہ گردش کرتا نظر آتا۔وہ ایسے جامع صفات بن گئے کہ جس کی ایک توجیہ مجموعہ اضداد سے ہونے لگی یعنی بھاری بھرکم وجود کے باوجود متحرک و فعال، زندگی میں کبھی ہم رنگ گل بالکل خاموش اور کبھی بلبل ہزار داستان، ایک طرف شعر و ادب کی رنگین نوائیاں اور نغمہ سرائیاں تو دوسری طرف فلسفہ و منطق کی موشگافیاں، نثر پر آئے تو ہزاروں صفحات روشنائی کی روشنی سے روشن تر ہو گئے اور شاعری کے کوچہ میں داخل ہوئے تو نعت و غزل کے ہزاروں اشعار ان کی روح میں پوشیدہ محبت کے سوز اور فراق کے درد کے ترجمان بن گئے۔مولانا ازہر شاہ قیصر خود ادب کی دنیا کے قیصر تھے لیکن قاضی صاحب کے بارے میں وہ یہ کہہ اٹھے کہ جامعیت علم اور فراوانی کمال کا اگر زندہ و خاموش نمونہ دیکھنا ہو تو قاضی صاحب کو دیکھیے۔

قاضی صاحب کو دیکھنے کی سعادت ہم کو بھی نصیب ہوئی، گو اس وقت ہم ان کی شخصیت کے جلوؤں کو سمجھنے کی عمر میں نہیں تھے لیکن قدرت کے شاہکاروں کو دیکھنے والے خواہ بچے ہوں یا بوڑھے ہوں، ان کے دل و دماغ پر نقوش تو ثبت ہی ہو جاتے ہیں۔

قاضی صاحب کو دور سے دیکھنے والوں کے لیے ان کی جس کتاب سے ان کے اندرون میں بھی جھانکنے کی مسرت اور توفیق مل سکتی ہے وہ میری نظر میں ان کی مشہور ترین کتاب "ہندوستان اسلام کے سایے میں" ہے۔ اس کتاب کو قاضی صاحب نے ازراہ انکسار ایک کتابچہ کہا اور اس کی تالیف کے بعد ان کی احسان شناس بلکہ مرتبہ شناس فطرت کو مولانا سید سلیمان ندوی کی برسوں پہلی بات اس طرح یاد آئی کہ "اس تاریخ نگاری یا حقیقت پسندی کی کوئی جھلک نظر آئے تو یہ اسی مقبول بارگاہ ہستی کی دعا کا کرشمہ ہوگا، لواقسم علی اللہ لابرہ، ورنہ من آنم کہ من دانم۔

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

کتاب تین سو بیس صفحات کی ہے اور بغیر کسی تصنع یا تکلف کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کتاب اپنے مصنف کی طرح البیلی اور مست خرام ہے۔ جگہ جگہ منظر اور ان کے رنگ جس طرح بدلتے ہیں اس کا نظارہ بہت کم کتابوں میں دکھائی دیتا ہے۔

قاضی صاحب کی طبیعت کی غمازی ٹائٹل ہی سے ظاہر ہونے لگتی ہے، سرورق پر ہندوستان اسلام کے سایہ میں لکھا ہے لیکن اندرونی ٹائٹل پر تحقیق الاثر فی معجزۃ شق القمر المعروف بہ راجہ بھوج کا اسلام لکھا ہوا ہے اور یہ متقدمین مصنفین کی پرزور یاد دلاتا ہے۔ پھر جہاں مضامین کی فہرست ہے وہاں یہ عبارت ملتی ہے کہ "ہندوستان اسلام کے سایے میں فہرست عنوانات ومندرجات کتاب شق القمر" یہ تو عنوانوں کا تنوع ہے۔ اس کے بعد تو جیسے مضامین موج در موج یا کہیے فوج در فوج کی شکل میں اس طرح آتے ہیں کہ پڑھنے والا خود اپنے بس میں نہیں رہتا۔ اصل موضوعات تو صاف ہے کہ ہندوستان میں اسلام کے ابتدائی نقوش کی تلاش ہے اور اس کے لیے شق القمر کا معجزہ اور راجہ بھوج کا اس کی وجہ سے اسلام کے سایے میں آنے کا معاملہ ہے، عموماً اس روایت کو واقعیت کی روشنی میں کم دیکھا گیا یا یہ کہیے کہ دیکھا ہی نہیں گیا۔ بہت سی چلتی ہوئی روایتوں کی طرح اسے بھی محض سنی سنائی بات سمجھ کر ان سنی کر دیا گیا لیکن اس کتاب میں اس روایت کی صداقت اس کے تحقیقی معیار اور اس کے قابل قبول ہونے کے عقلی دلائل کو جس مطالعہ اور جس پرلطف انداز سے پیش کیا ہے اس کے لیے صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ تحقیق اور پیشکش بے مثال اور بے نظیر ہے۔ دو باب ہیں جن کے ذیل میں قریب سوا سو سرخیاں اور عنوانات ہیں۔ پہلے باب میں شق القمر کے معجزہ کو سمجھنے کے لیے نبی کریمؐ کی بعثت سے پہلے دنیا کے مذہبی اور تہذیبی پس منظر میں انہوں نے قدیم مذہبوں، انسانی تمدن اور تہذیب کی اولین

علامتوں سے بات شروع کی اور پھر فن تحریر، بابل کا جادو، حکمت و فلسفہ، تاریخی ارتقا، اس کے قدرتی عوامل، انسان اول کا تصوراتی خاکہ، نظام فلکی، سبعہ سیارہ، دین اور مذہب کا نفسیاتی مطالعہ، ان سب پر وہ گفتگو کرتے جاتے ہیں اور پڑھنے والا سحر زدہ سا ہو کر دم بخود نظر آنے لگتا ہے۔ مضامین کے انبار سے ستارہ پرستی کی بات نکلتی ہے تو یہ سوال بھی سامنے آجاتا ہے کہ کیا برہما یا ابراہیم ایک ہی ہیں، اس کے بعد بابلی، کلدانی، مصری، ایرانی، منگولی، جاپانی قوموں کی زندگی اور عبادات کی باتیں ہیں اور یہ ایک منطقی ترتیب سے ہندوستان اور یہاں کی ستارہ پرستی کی جانب منتقل ہوتی جاتی ہیں۔ اسی ترتیب میں عرب کا ذکر ہے جس کا خاتمہ اسلام کے طلوع سے ملا دیا جاتا ہے اور شق القمر کا وہ موضوع آجاتا ہے جس کے لیے یہ کتاب تیار کی گئی۔ باب دوم یہیں سے شروع ہوتا ہے اور اب کیا بتائیں کہ اس باب میں عرب و ہند کے تعلقات میں انہوں نے جس طرح ہندوستان کو مسلمانوں کا آبائی وطن ثابت کیا ہے اور ایودھیا میں جہاں حضرت شیثؑ و ایوبؑ کے مزاروں کے جائے وقوع اور ان کی تاریخی حیثیت پر بحث کی ہے اس کا لطف صرف پڑھنے میں ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے ہر عہد میں ہندوستان سے عالمی رشتوں اور پھر علم حدیث اور تصوف کی بحث کو لا کر سرزمین مالوہ سے جوڑا ہے۔ لکھا کہ ''صوبہ مالوہ جو کشور ہند کا وسطانی صوبہ اور اندرونی علاقہ ہے اس میں مسلمانوں کی آمد کب ہوئی اور ہماری سرزمین میں کن بزرگان اسلام کا استقبال کیا گیا، اس پر مختصر روشنی ڈالنا ہے''۔ اس روشنی میں انہوں نے بتایا کہ مالوہ کی اسلامی تاریخ کے تین دور ہیں، سب سے پہلے محمد بن قاسم کے حملہ سندھ ۹۱ھ میں مسلمانوں کا ایک دستہ حبیب ابن مرہ کی سالاری میں شہر اجین پہنچ کر واپس ہو گیا، یہ گویا سمندر کی اوپری موج تھی جو آئی اور چلی گئی لیکن اس کے بعد وقتاً فوقتاً اطراف ہند سے مسلمان آتے رہے، جھنڈے گاڑتے رہے اور حالات کے لحاظ سے اس سرزمین پر جمتے اور اکھڑتے رہے۔ تیسرا دور التتمش کا ہے جب اس خطہ کو مسلمانوں نے مستقلاً اپنا وطن بنا کر بیرونی اسلامی ملکوں سے ماتحتی کا تعلق توڑ لیا۔ مالوہ کی تاریخ سے مناسبت پیدا کرنے کے بعد وہ اصل موضوع یعنی معجزہ شق القمر اور مالوہ پر آگئے اور لکھا کہ ''یہ عجیب و غریب کرشمہ خداوندی ہے کہ ہمارا یہ دور افتادہ صوبہ مہیب اور پر خطر جنگلوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں سے گھرا ہوا، خطہ عرب سے کالے کوسوں دور علاقہ جہاں نہ کبھی فاتح عالم سکندر اعظم کے قدم پڑ سکے اور نہ کبھی کسی غزنوی غوری نے ادھر کا رخ کیا۔ اسی ملک مالوہ میں نبی امی فداہ امی وابی کا شہرہ آفاق معجزہ شق القمر دکھائی دیا۔ اس کے بعد راجہ بھوج کا بیان شروع ہوتا ہے، وہ نواب شاہجہاں بیگم کی تاریخ تاج الاقبال کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کی عربی اور فارسی تاریخ اگرچہ تصدیق سے خاموش ہیں لیکن ایک فارسی قصیدہ جو عبداللہ شاہ چنگل کے

مقبرے کی دیواروں پر شہر پیراں دھار پر کندہ ہے وہ اس واقعہ کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ تو ایک منقول تصدیقی ثبوت ہے لیکن عقلی لحاظ سے قاضی صاحب نے تاریخی ثبوت پر جو بحث کی ہے اور جس کا اظہار انہوں نے اس جملے سے کیا کہ ”ظاہر ہے اہل ہند کی تاریخ میں راجہ کے ترک مذہب کے تذکرہ کو تلاش کرنا بے سود ہے کیوں کہ برادران وطن میں تاریخ نگاری کا ذوق ہی مفقود رہا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی قدیم کتابوں کی مدد سے اس دعویٰ کے جو دلائل ڈھونڈنے اور مرتب کرنے کی منطقی اور عقلی اور تاریخی کوشش کی ہے۔ اس کو دیکھ کر پڑھنے والا صرف ایک جہان حیرت کا تماشائی بن جاتا ہے۔ قلم کی رفتار بھی ان کی عجیب ہے۔ راجہ بھوج اور مالوہ ہوتے ہوئے وہ ریاست بھوپال پر آجاتے ہیں۔ بحث کا سرا راجہ بھوج ہی سے جڑا ہے لیکن وہ بھوپال پر یہ کہتے ہوئے آجاتے ہیں کہ سوال یہ ہے کہ بھوپال تال کیوں معرض وجود میں آگیا؟ جواب میں معلومات کا ایک خزانہ وہ پیش کر دیتے ہیں۔ بھوج پتری سے وہ حکایت لیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ پنڈتوں نے اپنے گیان دھیان سے اور اپنی پرانوں کو پڑھ کر یہ تجویز کیا کہ راجہ سات ندیوں کا پانی جمع کرے جس کے اندر ننانوے سوتے ہوں اور اس کا بند باندھا جائے جس سے چرند اور پرند ہمیشہ سیراب ہوتے رہیں۔ تاریخ کی بھول بھلیوں میں پڑھنے والا تھک نہ جائے، اس لیے انہوں نے اپنی مشہور نظم بھوپال تال بھی کتاب میں یہ کہہ کر درج کر دی کہ بھوپال تال کے اس پرسکون سطح سے انقلاب زمانہ اور حوادث روزگار کی کتنی لہریں گزریں اور کتنے انسانی قافلے اس کے کنارے اترے اور اپنے تہذیبی آثار اور تمدنی نقش و نگار صفحہ گنتی پر ثبت کیے اور پھر رخت سفر باندھ کر یہ سارے قافلے منزل اصلی کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ کہتے ہوئے قاضی صاحب نغمہ سرا ہو جاتے ہیں۔

اے کہ تو سرچشمہ عین کرم بحر نوال اے کہ تو آئینہ حسن خدائے ذوالجلال
تیری پیشانی منور، تیرا چہرہ خوش جمال سرزمین مالوہ کی آب جوئے بے مثال
اے حسیں بھوپال تال

ستائیس بندوں کی یہ نظم سیاست اور فرقہ پرستی کے مارے ہوئے سخت اور سنگ دل بھی سن لیں تو شاید اپنی اصل انسانی فطرت کی طرف لوٹنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس کے بعد کے صفحات شق القمر کے معجزہ کے برحق ہونے کے دلائل سے لبریز ہیں۔ کن کن باتوں کا ذکر کیا جائے۔ خاتمہ کتاب کی تحریر بتاتی ہے کہ قلم کے مسافر نے جب اس نورانی موضوع پر سفر کا ارادہ کیا تھا تو اس کو منزل دور دراز نظر آرہی تھی لیکن نصرت خداوندی نے مسافر کی قدم قدم پر رہنمائی کی۔ یہ ان کی کتاب کی آخری سطریں ہیں لیکن جو سطریں بالکل شروع میں لکھی گئیں قاضی صاحب کا علم اور ان کے تجزیاتی مطالعہ کی گہرائی

اور اس کی وسعت کے پیمانے وہیں سے شروع ہوتے ہیں۔ یہ عبارت یا سطریں بار بار کسی بیت الغزل شعر کی طرح حرف مکرر کا تقاضا کرتی ہیں۔ جیسے:

اس بزم کائنات میں خالق فطرت کا سب سے زیادہ عجیب و غریب کرشمہ اور سب سے عظیم و جلیل تحفہ جلوۂ حیات کی نمو ہے۔ یہ خاک دان ارضی یعنی ہماری یہ زمین ہر طرح کی جلوہ آفرینیوں کا روشن و درخشاں آئینہ ہے۔ اس آئینہ خانہ میں جو زندگی ہمہ جہتی شعاعوں کا عکس بکھیرتی ہے وہ حیات انسانی ہے۔

عالم انفس و آفاق کے صدیوں کے مطالعہ و مشاہدہ اور تجربہ نے دماغ میں معلومات کی ایک دنیا آباد کر دی جو لوح ذہن سے منتقل ہو کر صفحہ قرطاس پر جلوہ گر ہوئی، جب ان افکار و خیالات اور اعتقادات نے انسانی زندگی کو ایک نظم گوہریں میں پرو دیا اور انہوں نے الفاظ کا جامہ پہنایا تو مذہب کے ساتھ تاریخ نے بھی اپنے پر و بال نکالے۔

ہم نہیں جانتے کہ اس مختصر تعارف سے کتاب پڑھنے کا شوق اور خود قاضی صاحب کے علمی عبقریت کو جاننے کا ذوق ملا یا نہیں، لیکن کتاب کا مقصد کیا ہے، اس کو انہی کے الفاظ میں بیان کرنا بہر حال ضروری ہے اور اسی پر اس مختصر گفتگو کا اختتام بھی ہے۔ لکھتے ہیں:

اس کتاب میں سر زمین ایشیا (مشرق) نے جو عالمی تحفہ شریعت و تدین اور تہذیب و تمدن کا عالم انسانیت کو دیا ہے اس کو اجمالی طور پر پیش کر کے عرب و ہند کے ہزارہا سالہ قدیم تعلق کی روشنی میں ہندوستان سے اسلام کے چودہ سو سالہ دیرینہ رشتہ کو ایک دلکش تحقیقاتی و روایاتی خاکہ کے ساتھ واقعیت کے چوکھٹے میں نمایاں کیا گیا ہے۔

برطانوی سامراجی ارباب تاریخ نے ہندو مسلم تعلقات کے نازک رشتہ میں تو بر تو غلط فہمیاں قصداً پیدا کر کے جو گرہیں لگادی ہیں ان کو کھولنے کی سعی کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام کے معجزہ شق القمر کے مشاہدے نے ہمارے ملک کی سطح پر جو مثبت لہریں پیدا کی تھیں ان کو معرض بیان میں لا کر خود اس آسمانی معجزے کی جلالت و عظمت کو واشگاف کر کے وحدت اقوام کی عالمگیر دعوت کو اس کتاب کا نقطہ اختتام بنایا گیا ہے۔ قاضی صاحب پوچھتے ہیں کہ اس خام و پختہ مواد کے ذریعہ دعوت الٰہی کو پیش کرنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے؟ قاضی صاحب کے اس سوال کا جواب تو ایماندار قاری کے ذمہ ہے۔

(یہ مضمون بھوپال میں قاضی وجدی الحسینی سیمینار میں پیش کیا گیا۔)

ہندوستانی خواتین کی قرآنی خدمات

جناب سفیان احمد انصاری

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی

sufyanahmadansari2@gmail.com

قرآن مجید اللہ کی آخری مقدس کتاب ہے جسے اللہ نے عربی زبان میں نازل فرمایا۔اس وجہ سے غیر عربی داں کو اسے سمجھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ عجم کے لوگ جب حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے، جن میں اکثر عربی زبان سے ناواقف تھے، تو ان کی یہ خواہش ہوئی کہ اپنی مقدس کتاب اور اس کے علوم (اسباب نزول، مکی و مدنی وغیرہ) سے واقف ہوں۔اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کی تفسیر بیان کی جائے۔ چنانچہ ترجمہ و تفسیر کا کام ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ مشہور مؤرخ علامہ سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

> اسلام جب سرزمینِ عرب سے نکل کر اُن ممالک میں پہنچا جو عربی زبان سے ناواقف تھے اور وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجاً کی قرآنی پیشین گوئی کے مطابق لوگ جوق در جوق اسلام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تو اُن کو ضرورت پیش آئی کہ کتاب اللہ کو ترجمے کے ذریعہ سے اپنی ملکی زبان میں سمجھیں، چنانچہ اس قسم کی کوشش صحابہ کرامؓ کے زمانہ ہی میں شروع ہو گئی تھی۔ شمس الائمہ سرخسیؒ نے المبسوط میں لکھا ہے کہ فارس کے لوگوں کے لیے جو عربی زبان سے ناواقف تھے حضرت سلمان فارسیؓ نے سورۂ فاتحہ کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا۔[1]

تبھی سے قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر لکھنے کی شروعات ہوئی جس کا سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ امت میں ایسے بہت سے خوش نصیب افراد ہوئے ہیں جنھیں ترجمہ و تفسیر لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی کسی کتاب کی اتنی خدمت نہیں کی گئی جتنی قرآن مجید کی خدمت کی

---

[1] محمد سالم قاسمی، سید عبد الرؤف عالی اور سید محبوب رضوی ،جائزہ تراجمِ قرآنی ، مجلس معارف القرآن، دیوبند،۱۹۶۰،ص ۱۱

گئی۔ قرآن مجید کی مکمل اور جزوی (سورتوں اور آیات کی) تفسیریں ہزاروں کی تعداد میں اور دنیا کی ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔

قرآن مجید کی تفسیر و ترجمہ لکھنے کا کام جہاں مردوں نے کیا ہے وہیں خواتین نے بھی اس کام میں دلچسپی دکھائی اور کئی خواتین نے عمدہ علمی کام کیا۔ یہاں تک کہ جب اُردو زبان کا آغاز ہوا تو جہاں دیگر اسلامی و غیر اسلامی علوم کا کام اردو زبان میں شروع ہو گیا وہیں اس مقدس کتاب قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر بھی اردو زبان میں تحریر کیا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو زبان اسلامی لٹریچر سے مالا مال ہے اور اردو زبان میں علوم اسلامیہ کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

زیر نظر مضمون اُن ہندوستانی خواتین کے ذکرِ جمیل پر مشتمل ہے جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر یا ترجمہ کیا ہے، یا مکمل ترجمہ یا تفسیر تو نہیں کیا لیکن اس تعلق سے جزوی کام کیا ہے، یا اپنی نگرانی میں کسی ماہر عالم سے تفسیر یا ترجمہ کا کام کروایا ہے۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ مفسرین و مترجمین کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخین اور سوانح نگاروں نے خواتین کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ترجمہ یا تفسیر کرنے والی خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلے میں بہت کم ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس باب میں خواتین کی نمائندگی بالکل نہ ہو۔ شیخ محمد خیر رمضان یوسف نے تذکرہ و تراجم کی کتابوں میں بہت غائرانہ انداز سے تفتیش و تفحّص کے بعد اپنی کتاب المؤلّفات من النساء ومؤلّفاتھن فی التاریخ الاسلامی میں ۱۲۰۰ھ تک چھتیس (۳۶) مؤلّفات کا تذکرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ان کی کتابوں کی تعداد عربی زبان میں سو سے زیادہ نہ ہو گی۔[۲]

اُردو زبان میں بھی ایسی خواتین کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ معدودے چند خواتین کے نام ہی ملتے ہیں جنھوں نے علوم قرآنی پر کام کیا ہے۔ شیخ محمد خیر رمضان یوسف نے تفسیر و ترجمے کے باب میں خواتین کی تعداد کم ہونے کے درجِ ذیل تین اسباب بیان کیے ہیں:

۱۔ تصنیف و تالیف ذہنی سکون و اطمینان اور کسی حد تک فرصت و فراغت کا تقاضا کرتی ہے، جب کہ خواتین اپنی فطری مصروفیات، مثلاً حمل، ولادت، رضاعت، بچوں کی پرورش اور گھریلو کاموں میں مصروفیت وغیرہ کی وجہ سے بیش تر اوقات اس سے عموماً محروم رہتی ہیں۔

---

[۲] محمد خیر رمضان یوسف، المؤلفات من النساء ومؤلفاتھن فی التاریخ الاسلامی، دار ابن حزم، ۲۰۰۰، ط: ۲، ص ۵۔

۲۔ خواتین کی رغبت عموماً تحریر و تصنیف کے مقابلے میں کہنے سننے کی طرف زیادہ رہتی ہے۔اسی لیے ان کی صلاحیتوں کا اظہار شاعری، ادب، لغت اور انسانی و وجدانی علوم میں دیگر میدانوں کے مقابلے میں زیادہ ہوا ہے۔(علم حدیث کی بنیاد سماع و روایت پر ہے، اس کے لیے تحریر شرط نہیں ہے، اسی لیے اس میں خواتین کی صلاحیتوں کا غیر معمولی اظہار ہوا ہے اور ہزاروں کی تعداد میں محدّثات پیدا ہوئی ہیں)۔

۳۔ خواتین کی بہت سی تصنیفات، جو ایک عرصہ تک امت کے درمیان متداول تھیں، حوادثِ زمانہ کی نذر ہو گئیں اور مورخین اور تذکرہ و تراجم کی کتابیں تالیف کرنے والوں نے ان صاحبِ تصانیف خواتین کے حالات لکھنے سے تغافل برتا کیوں کہ عموماً پردہ نشیں خواتین کے حالات جمع کرنے میں بہت دشواریاں تھیں۔[۳]

مذکورہ اسباب کے علاوہ تفسیرِ قرآن کے میدان میں خواتین کی نمائندگی کم ہونے کے درج ذیل دو سبب اور ہیں:

(۱) ایک مفسر کے لیے علم لغت کا ماہر، صرف و نحو کے قواعد کا عالم، علم الاشتقاق، علم معانی، بیان اور علم بدیع سے واقف، علم بلاغت کا عالم، مختلف قرأتوں سے آگاہ، علم کلام، اسباب نزول، علم ناسخ و منسوخ سے آشنا، احادیث نبویہ کا عالم اور اسالیب قرآن میں تبحر ہونا ضروری ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ ان سارے علوم کو جاننے کے لیے کافی وقت اور سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے جس میں خواتین مردوں کے بہ نسبت پیچھے رہ جاتی ہیں۔

(۲) ایک زمانے تک مسلم معاشرہ میں عورتوں کے حالات مخفی رکھنے کا رواج عام رہا ہے، اور خواتین کے نام کا اظہار معیوب سمجھا جاتا رہا ہے۔ اُس زمانے میں اگر کسی خاتون نے کوئی علمی کام کیا بھی، تو اس کا نام مخفی رکھا گیا اور اس کے نام کے بجائے کسی اور مرد کے نام سے وہ علمی کارنامہ منظر عام پر لایا گیا۔

مندرجہ بالا اسباب و وجوہات کی بنا پر تفسیری میدان میں خواتین کی خدمات مردوں کے مقابلے میں کم ہیں۔ لیکن یہ شعبہ بھی ہندوستانی خواتین کی خدمات سے خالی نہیں۔ چنانچہ اس باب میں سب سے پہلا نام جاناں بیگم کا آتا ہے۔

---

[۳] حوالہ سابق، ص ۱۵-۳۱

جاناں بیگم: بادشاہ جلال الدین اکبر کے نورتنوں میں سے ایک مرزا عبدالرحیم خان خاناں (۱۵۵۲ء۔۱۶۲۷ء) تھے جن کی اکلوتی صاحبزادی جاناں بیگم تھیں۔ ان کی وفات ۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء میں ہوئی۔ ان کی شادی مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے فرزند شہزادہ دانیال سے ہوئی تھی۔ حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں کی مالک تھیں۔ جاناں بیگم عالمہ اور قرآن کی مفسرہ تھیں۔ انھوں نے فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی۔ مولانا محمد اسحاق بھٹی لکھتے ہیں:

> امورِ دینیہ سے اس کی دلچسپی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس نے فارسی زبان میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو اس وقت مضامین و مندرجات کی خوبی وندرت کی بناپر قبولیتِ عامہ کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ شہنشاہِ اکبر نے اس تفسیر کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا، اور جاناں بیگم کے اس علمی کارنامے کے صلے میں اسے پچاس ہزار دینار عطا کیے اور انتہائی مسرت کے ساتھ اسے اپنے ذاتی کتب خانے میں ممتاز جگہ دی۔[۴]

زیب النساء: اس سلسلے میں دوسرا اہم نام زیب النساء بنت اورنگزیب عالمگیرؒ کا ہے جس نے خود تو کوئی ترجمہ یا تفسیر نہیں تحریر کیا لیکن اپنی نگرانی میں تفسیر لکھوائی۔ زیب النساء شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی سب سے بڑی اور چہیتی صاحبزادی تھیں۔ وہ ۵/فروری ۱۶۳۹ء کو دکن کے شہر دولت آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کی والدہ دلرس بانو بیگم، اورنگزیب کی پہلی بیوی تھیں اور صفوی ایران (فارس) کے ممتاز خاندان کی شہزادی تھیں۔ زیب النساء نے سات سال کی عمر میں ایک حافظہ علی مریم اُم عنایت کی نگرانی میں تین سال میں قرآن کریم حفظ کیا۔ اس موقعہ پر اورنگ زیب نے ایک بڑی دعوت کی اور عوامی تعطیل کا اعلان کیا۔ اور تیس ہزار سونے کے سکے کا انعام دیا اور بیٹی کو اچھی طرح تعلیم دینے کے لیے استانی بی کو بھی بطور انعام سونے کے تیس ہزار سکے دیے۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں:

> زیب النساء مغلیہ سلطنت کے عظیم فرماں روا اور چھٹے بادشاہ محی الدین اورنگ زیب کی سب سے بڑی اولاد تھی۔ اس نے جب اس جہانِ فانی میں آنکھ کھولی تو علم وادب کا تابناک سورج گمراہی کے ہر ہر گوشے کو خیرہ کر رہا تھا۔ دانشوری کی شبنم چن چن کر ایک ایک کانٹے کو پھولوں کی طرح مہکا رہی تھی۔ اس نے اپنے سر پر نظر ڈالی تو جس مشفق باپ کا ہاتھ تھا وہ زمانہ میں یکتا انشاء پرداز، زہد و تقویٰ کا لباس ڈالے ہوئے ایک نہایت عظیم الشان فاتح تھا، جس نے دین میں

---

[۴] محمد اسحاق بھٹی، باکمال خواتین، مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، ۲۰۱۲، ص ۱۶۷۔۱۶۸۔

رائج ہوئی لغویات کو جیسے ختم کرنے کی قسم کھالی تھی۔اپنے اطراف میں نظر ڈالی تو ایک سے بڑھ کر ایک عالم، فاضل، انشاپرداز، صوفی، ادیب، مورخ، تذکرہ نویس، اور شاعروں کا جم کثیر نظر آیا۔ مختصرا اگر یہ کہا جائے کہ اس زمانے تک ہندوستان علم وادب ہنر و آگہی کا شہرستان بن چکا تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ زیب النساء کو جس علم کی سب سے پہلے تعلیم دی گئی وہ کلام اللہ تھا۔اس نے کم عمری میں ہی کلام اللہ حفظ کر لیا۔اس کے علاوہ اس نے علوم معقولہ و منقولہ میں کامل دستگاہ کرلی۔

زیب النساء عربی، فارسی اور اُردو کی ماہر تھیں،اور فارسی زبان کی اچھی شاعرہ تھیں۔ملا سعید سے اصلاح لیتی تھیں۔ان کو فن شاعری کے بنیادی اور اعلیٰ منازل پر کامل دسترس حاصل تھا۔ حمد و نعت لکھنے کا شوق تھا تصوف اور اخلاقیات پر بھی زیب النساء کے اشعار ملتے ہیں۔

زیب النساء کی وفات باسٹھ سال کی عمر میں ۱۷۰۱ء میں ہوئی جب کہ عالمگیر کی تخت نشینی کا اڑتالیسواں سال تھا۔ تجہیز و تکفین دلی ہی میں ہوئی۔ زیب النساء ایک اچھی مصنفہ اور بہترین قلم کار تھیں۔ان کی اپنی تصنیف ”زیب المنشآت“ ہے۔احمد علی سندیلوی اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”زیب المنشآت کہ از تالیف آنجناب است فقیر آں را زیارت نمودہ“[۵] (یعنی زیب المنشآت آنجناب (زیب النساء) کی تالیف ہے، فقیر (احمد علی سندیلوی) نے اس کی زیارت کی ہے)۔

زیب النساء علم پرور اور علم دوست خاتون تھیں۔زیب النساء کی اپنی ایک لائبریری بھی تھی۔اس لائبریری نے دیگر لوگوں کے ذاتی ذخیرۂ کتب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ زیب النساء نے ادبی کام کرنے یا مخطوطات نقل کرنے کے لیے بہت سارے اہل فن علماء کو آزادانہ تنخواہوں پر بطور ملازمت رکھ رکھا تھا۔زیب النساء کا دربار در حقیقت ایک اکادمی (بیت العلوم) تھی۔اس میں ہر فن کے علماء اور فضلاء ملازم تھے جو ہمیشہ تصنیف اور تالیف میں مصروف رہتے تھے۔زیب النساء کے زیر نگرانی لکھی جانے والی کتابیں عموماً اس کے نام موسوم ہوتی تھیں یعنی ان کتابوں کے نام کا پہلا جز ”زیب“ کا لفظ ہوتا تھا۔ اس سے اکثر تذکرہ نویسوں کو مغالطہ ہوا ہے اور انھوں نے وہ کتابیں زیب النساء کی تصنیفات میں شمار کیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ کتابیں زیب النساء کی تصنیف نہیں ہیں۔

زیب النسا نے جو کتابیں تصنیف کرائیں ان میں انیس الحجاج، تحفۃ الاخیار اور سب سے اہم و قابل ذکر

---

[۵] تذکرہ مخزن الغرائب قلمی نسخہ۔

تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ ہے جو ملا الدین اردبیلی (جو کشمیر میں مقیم تھے) کا تحریر کردہ ہے، اور اس کا نام زیب التفاسیر ہے۔ نزہۃ الخواطر میں مرقوم ہے :

وأمازیب التفاسیر فہو ترجمۃ التفسیر الکبیر للرازی بالفارسی نقلہ من العربیۃ إلی الفارسیۃ الشیخ صفی الدین الاردبیلی ثم الکشمیری بامرھا ولذلک سماہ باسمہا[۶] (زیب التفاسیر امام فخر الدین رازیؒ کی تفسیر کبیر کا فارسی ترجمہ ہے جسے شیخ صفی الدین اردبیلی ثم کشمیری نے زیب النساء کے حکم سے تحریر کیا ہے، اسی لیے اُس کا نام زیب النساء کے نام پر زیب التفاسیر رکھا گیا)۔

سکندر جہاں بیگم : جس طرح زیب النساء نے شیخ صفی الدین سے زیب التفاسیر کے نام سے قرآن کریم کی تفسیر لکھوائی تھی، اسی طرح نواب سکندر جہاں بیگم نے بھی شیخ احمد داغستانی سے ترکی زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کروایا۔

سکندر جہاں بیگم ریاست بھوپال کی نواب تھیں۔ ان کی ولادت ۲۸ /شوال ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۰ /ستمبر ۱۸۱۷ء بروز بدھ گوہر محل، اسلام نگر، بھوپال میں ہوئی۔ والد نواب ناصر محمد خان رئیس ریاست بھوپال کا جب ۱۲۳۳ھ، ۱۸۱۸ء میں انتقال ہوا تو سکندر جہاں کی والدہ نواب قدسیہ بیگم، بیگم بھوپال کے عہدے پر متمکن ہوئیں۔ اس وقت سکندر جہاں بیگم محض ۸ /سال کی تھیں۔

۱۸۳۷ء میں جب سکندر جہاں بیگم کی والدہ نواب قدسیہ بیگم کی وفات ہوگئی تو سکندر جہاں بیگم کے شوہر نواب جہانگیر محمد خان بہادر نواب بھوپال بنے۔ ۹ /دسمبر ۱۸۴۴ء کو نواب جہانگیر محمد خان بہادر کے انتقال کے بعد سکندر بیگم نے انتظام ریاست سنبھالا، اور بیگم بھوپال بنیں۔

سکندر جہاں بیگم بروز جمعہ ۱۳ /رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۳۰ /اکتوبر ۱۸۶۸ء کی شام بعارضہ گردہ بعمر ۵۱ /سال ایک ماہ ۲۰ /دن (شمسی سال کے حساب سے) انتقال فرما گئیں۔

نواب شاہ جہاں بیگم : نواب سکندر جہاں بیگم کی صاحب زادی اور جانشین نواب شاہ جہاں بیگم نے اپنے والدہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مولانا جمال الدین وزیر ریاست بھوپال سے پشتو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کروایا۔

سلطان شاہ جہاں بیگم ریاست بھوپال کی دسویں حکمراں اور تیسری بیگم بھوپال تھیں۔ ان کی

---

[۶] نزہۃ الخواطر ۶/۷۲۴

پیدائش بروز پیر ۶؍جمادی الاولی ۱۲۵۴ھ مطابق ۳۰/جولائی ۱۸۳۸ء کو قلعہ اسلام نگر، بھوپال میں ہوئی۔ قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہانت، استقلال اور قابلیت اُنہیں وافر مقدار میں عطا ہوئی تھی۔

شاہ جہاں بیگم کا پہلا نکاح ۱۶/سال کی عمر میں نصیر الدولہ باقی محمد خان نصرت جنگ، سپہ سالار ریاست بھوپال سے ہوا جن کے انتقال کے بعد دوسرا نکاح نواب صدیق حسن خان سے ہوا۔ ۲۶/مئی ۱۸۹۰ء کو نواب صدیق حسن خان انتقال کر گئے تو شاہ جہاں بیگم ۵۲/سال کی عمر میں دوبارہ بیوہ ہو گئیں۔

شاہ جہاں بیگم خود بھی ایک مصنفہ تھیں۔ کئی دیگر نثری کتب کے علاوہ تہذیب النسواں اور خزینۃ اللغات ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ایک مذہبی کتاب تصنیف کر رہی تھیں لیکن وہ مکمل نہ ہو سکی۔

شاہ جہاں بیگم شاعرہ بھی تھیں۔ فارسی زبان میں شعر کہتی تھیں۔ پہلے شیریں بعد میں تاجور تخلص کرتی تھیں۔ ان کا پہلا دیوان ''دیوانِ شیریں'' اور دوسرا ''تاج الکلام'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی ایک مثنوی ''صدق البیان''، فن شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

شاہ جہاں بیگم علم کی قدر شناس تھیں۔ انھوں نے علمی کاموں میں ایسی فراخدلی دکھائی کہ تمام بیگمات بھوپال کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ایک محکمہ بنام مطبع شاہجہانی قائم کیا گیا جس میں قرآن مجید کی طباعت کی جاتی تھی اور یہ قرآن مجید عوام میں بلا ہدیہ تقسیم کیے جاتے تھے۔ نیل الاوطار، فتح البیان، تفسیر ابن کثیر، الروضۃ الندیۃ، نزل الابرار، جلاء العینین، فتح الباری فی شرح صحیح البخاری جیسی نایاب و نادر کتب کو شائع کروایا اور اِس میں زرِ کثیر صرف ہوا۔ فتح الباری پہلی مرتبہ مطبع شاہجہانی سے ہی شائع ہوئی تھی۔

شاہ جہاں بیگم نے بھوپال کی عظیم جامع مسجد تاج المساجد تعمیر کروائی۔ اُس وقت دہلی میں مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت تھی۔ اِس مسجد کی تعمیر کا کام جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دنوں میں تعطل کا شکار ہو گیا تھا۔ بعد ازاں یہ مسجد جدید طرز پر ۱۹۷۱ء میں مکمل ہوئی۔ مسجد کا اندرونی رقبہ ۴۳۰۰۰۰؍مربع فٹ (۴۰۰۰۰/مربع میٹر) ہے جس میں ۱۷۵۰۰۰/ نمازیوں کی گنجائش موجود ہے۔ تاج المساجد ایشیا کی بڑی مساجد میں سے ایک ہے۔

شاہ جہاں بیگم نے کئی لاکھ روپے صرف کر کے شہر کی اکثر مساجد کو پختہ کروایا۔ شاہ جہاں بیگم کے عہد حکومت میں ہر مسجد میں امام، مؤذن اور جاروب کش مقرر کیے گئے۔ مساجد میں روشنی، جائے

نماز اور گرم پانی کا انتظام کیا گیا۔ رمضان میں حفاظ قرآن کے لیے انعام، شیرینی اور مفت بعام تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ نواب سکندر بیگم کے عہدِ حکومت (۱۸۴۴ء–۱۸۶۸ء) میں ہر سال ایک قافلہ سرکاری خرچ پر حج پر جانے لگا۔ حصولِ ثواب اور ردِّ بلا کی خاطر ایک ختم خانہ قائم کیا گیا جس میں متعدد اشخاص قرآن مجید کی تلاوت کی خاطر ملازم رکھے گئے۔ یہ اشخاص حدیث نبویؐ کی تعلیم بھی دیتے تھے۔

شاہ جہاں بیگم نے اپنے دور حکومت میں ہر تحصیل میں ایک سرکاری طبیب مقرر کیا۔ حسبِ ضرورت طبّی شفاء خانے قائم کیے۔ شہر بھوپال میں ایک بڑا شفاء خانہ اور خواتین کے لیے ایک مخصوص شفاء خانہ قائم کیا۔ زچہ و بچہ کی حفاظت و نگرانی کا خاص انتظام کیا۔ جذامیوں کے لیے شفاء خانہ تعمیر کروایا۔ چیچک کے ٹیکہ کا باقاعدہ انتظام ہوا اور جو بچوں کو ٹیکہ لگوائیں، اُن کو ریاست کی جانب سے انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ رعایا کے اطمینان کی خاطر اپنی نواسی بلقیس جہاں بیگم کو چیچک سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوایا۔

اواخر ماہِ اکتوبر ۱۹۰۰ء میں شاہ جہاں بیگم کو بائیں رخسار میں سرطان ہو گیا جس میں گیارہ مہینے مبتلا رہیں۔ بالآخر بروز اتوار ۲۸/صفر ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۶/جون ۱۹۰۱ء کو ۶۲ سال، ۵ ماہ، ۱۷ دن (شمسی) کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ اور باغِ نشاط افزا میں تدفین کی گئی۔

بیگم نور محل: بیگم نور محل کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں حاصل ہو سکیں، اس لیے خواتین اور خدمتِ قرآن کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

> بیگم نور محل کا تعلق حاتم خان راج شاہی کے ایک بنگالی خاندان سے تھا۔ ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم نے لکھا ہے کہ انہوں نے بنگالی زبان میں پارۂ عمّ کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔ ان کا یہ منظوم ترجمہ قرآن مکل (Quran Mukul) کے نام سے ۱۹۴۰ء کے اواخر میں کوہِ نور الیکٹرانک پریس، اندر کلا چٹاگانگ سے شائع ہوا۔ اس ترجمے کو نور محل نے اپنے والد کو معنون کیا تھا، جن کا نام خان بہادر عماد الدین (۱۸۷۵ء۔۱۹۳۵ء) تھا۔ محمد مجیب الرحمٰن نے لکھا ہے کہ اس ترجمے کو قارئین کے درمیان بہت مقبولیت حاصل ہوئی، چنانچہ اس کے پے در پے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔[۷]

اس سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ بیگم نور محل نے منظوم شکل میں قرآن کی ایک پارہ (عم) تفسیر لکھی تھی۔ اس طرح بیگم نور محل بھی قرآن کی خدمت کرنے والی خواتین میں شامل ہیں۔

---

[۷] بحوالہ خواتین اور خدمتِ قرآن، ص ۲۸۰

محمودالنساء بیگم: محمود النساء بیگم حیدر آباد دکن کے ایک علمی گھرانے میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۶۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔آپ کے والد سید محمد یوسف الدین حکومت نظام میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

محمودالنساء بیگم ایک باصلاحیت اور متقی خاتون تھیں۔ان کا قرآن فہمی کا ذوق نہایت عمدہ تھا۔وہ بچپن ہی سے ذہین تھیں۔انہیں عربی، فارسی، اردو اور انگریزی وغیرہ زبانوں پر عبور حاصل تھا۔علوم اسلامیہ پر ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ محمودالنساء بیگم نے ۱۹۴۳ء میں "تفسیر قرآن مجید مع ترجمہ احکام قرآن" تالیف کیا جو بلا متن ترجمہ ہے۔انھوں نے اس ترجمے اور تفسیر میں صرف اپنی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں کیا بلکہ شاہ عبدالقادر کے موضح القرآن اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمے سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ اس کے سرورق پر اس کا تعارف اس طرح کرایا گیا: ''قرآن مجید کا ایک ایسا مکمل ترجمہ و تفسیر جسے دنیا کے کتب خانوں میں خواتین کے قلم سے تراجم و تفاسیر میں اولیت حاصل ہے''۔

اس ترجمہ و تفسیر کے لکھنے کی وجہ محمودالنساء بیگم خود بیان کرتی ہیں :

> عربی نہ سمجھنے والوں کے لیے با ترجمہ قرآن شریف بہت ہیں، مگر عربی کے احترام کی وجہ سے ہر کس و ناکس کا ان کو چھونا یا پڑھنا، یا بے محل حمل و نقل، بے ادبی سے خالی نہیں۔بے تکلفی سے ہر شخص پڑھ نہیں سکتا۔ دنیوی امور میں سینکڑوں دشوار گزار راستے انسان چلتا ہے، لیکن مذہبی امور میں ذرا سی مشکل مل جائے تو حیلہ جوئی کرتا ہے۔اس لیے آسان سے آسان تر طریقے سے مسلمانوں کی سمجھ میں اپنا مذہب آجائے، بس یہی گنہگار کا مقصد ہے۔ محض ان سہولتوں کا لحاظ کرنے اور نہ پڑھنے کے عذرات کو دور کرنے کی غرض سے یہ ترجمہ لکھا گیا ہے۔ چنانچہ اس کی اشاعت کے جواز کا فتوی دار القضاء و دار الافتاء دار العلوم قادریہ عالیہ بدایوں سے حاصل کیا گیا۔[۸]

غالباً مؤلفہ کی عزلت پسندی، گمنامی اور شہرت سے دور رہنے کے جذبے نے اسے تاریخ کے سرد خانے میں ڈال دیا تھا،اور اس ترجمہ و تفسیر کی اشاعت بہت قلیل تعداد میں ہوئی تھی،اس لیے بہت جلد یہ ترجمہ نایاب ہو گیا۔اس ترجمے کا ذکر ڈاکٹر احمد خان نے اپنے مقالے میں کیا ہے جو کراچی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔

مفتی سراج الہدیٰ ندوی ازہری نے بڑی جد و جہد کے بعد اس ترجمے کو حاصل کر کے ساڑھے تین

---

[۸] مقدمہ مؤلفہ، بعنوان تمہید

سال کی عرق ریزی سے اس کی تحقیق کی،اور اس کو جدید انداز واسلوب میں ڈھالا، جس کا نام "آسان ترجمہ وتفسیر قرآن مجید" رکھا ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ۶۸۸ صفحات ہیں، سورۂ فاتحہ تا سورۂ کہف، جبکہ دوسری جلد ۹۹۶ صفحات پر مشتمل ہے،اس میں سورۂ مریم سے سورۂ ناس تک کا ترجمہ وتفسیر ہے۔ شروع میں تقریباً ۶۰ صفحات میں محقق کا مقدمہ اور مفسرہ کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

اس کام کو موصوف نے اپریل ۲۰۱۵ء میں مکمل کیا، جسے محمود النساء کے افرادِ خاندان نے شائع کروایا ہے۔ مولانا موصوف نے اس ترجمے میں متروک الفاظ حذف کر کے انہیں جدید اسلوب وبیان کے مطابق استعمال کیا ہے۔ یہ ترجمہ جس دور میں کیا گیا تھا اس دور کے اعتبار سے اس کی زبان اور اس کا اسلوب نہایت شاندار ہے۔ ترجمہ بامحاورہ ہے۔ محترمہ نے ترجمے کے دوران بین القوسین میں مفید وضاحتیں بھی کی تھیں۔ ترجمہ کی زبان ایسی ہے کہ اگر قوسین کو حذف کر دیا جائے تو ان کی مختصر توضیحات کے سبب یہ ترجمہ بہترین ترجمانی قرار پائے گا،اور تفہیم کے لیے مزید مفید ہو جائے گا۔ اس کے مختصر تفسیری حواشی حشو وزوائد سے پاک اور عام انسان کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیے گئے ہیں۔ ترجمے کی اپنی مسلم حیثیت ہونے کے باوجود وضاحت کی گئی ہے اور مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ کو اور اس پر موجود حواشی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ گویا اس طرح اس کو شیخ الہندؒ کے ترجمے کی تسہیل قرار دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اس ترجمہ وتفسیر کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انداز عام فہم ہے، ترجمہ بہت آسان اور قریب الفہم ہے، تفسیر نہایت مختصر اور ضروری سمجھ کر ہی کی گئی ہے، ہر جگہ تفہیم کے پہلو کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ معتبر روایات سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ثریّا شحنہ: محترمہ ثریا شحنہ صاحبہ ایک مایۂ ناز مترجمہ ومفسرہ ہیں جو کرناٹک کی رہنے والی ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئیں اور ابھی باحیات ہیں۔ انھوں نے مکمل قرآن مجید کا عام فہم ترجمہ وتفسیر تحریر کیا ہے۔ یہ قرآن کریم کا لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے۔ ثریا شحنہ کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کی تلاوت کرنے والا اس کے ہر لفظ کے اصل معنٰی کو بھی سمجھ سکے۔

محترمہ نے شروع سے ہی اپنی توجہ قرآن کی طرف مبذول کرتے ہوئے پہلے عربی زبان میں مہارت حاصل کی، پھر عورتوں اور بچیوں کو ترجمۂ قرآن سکھایا،اور پندرہ سال کی اس محنت اور کوشش کو تحریری شکل میں جمع کر کے دوسروں کے استفادے کے لیے "تبیین القرآن فی تفسیر القرآن" کے نام سے ۲۰۱۲ء میں آر ایس ٹریڈنگ کمپنی حیدرآباد سے شائع کیا۔ سرورق پر اس تفسیر کا تعارف اس طرح کیا

گیاہے: ''یہ تفسیر قرآن کریم کالفظ بہ لفظ آسان اردو ترجمہ اور آیات کی تفسیر احادیث مبارکہ سے ہے''۔

نام سے تو اشارہ ملتاہے کہ یہ صرف ترجمہ نہیں بلکہ قرآن کی تفسیر ہے، لیکن بعض اہلِ قلم حضرات نے یہی تحریر کیاہے کہ ثریا شحنہ نے صرف قرآن کا تحت السطور ترجمہ ہی کیاہے۔ مولانا عبداللہ جولم عمری اس ترجمہ کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :

> تبیین القرآن فی تفسیر القرآن محترمہ ثریا شحنہ کی پندرہ سال کی کاوش کا نتیجہ ہے، جنھیں انھوں نے قرآن کریم کو سمجھنے اور سمجھانے میں صرف کیا۔ ہمارے علم کے مطابق کسی صنف نازک کی یہ پہلی کوشش ہے جو منظر عام پر آنے جارہی ہے۔ مصنفہ نے ترجمہ لفظ بہ لفظ کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ کم سے کم عربی جاننے والا بھی بہ آسانی قرآن کے معانی سے واقف ہوسکے۔ اور ساتھ ہی آیت کی تفسیر میں وارد صحیح احادیث کا ترجمہ ہو بہو پیش کرکے پڑھنے والے پر چھوڑ دیاہے تاکہ اس کی روشنی میں ان کی جانب سے مداخلت کے بغیر وہ جو بھی مفہوم سمجھ سکتے ہیں، سمجھ لیں۔[۹]

نکہت شاہجہاں پوری: نکہت شاہجہاں پوری نے ۱۹۴۴ء میں ''بصائر القرآن'' کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو ممبئی سے شائع ہوئی تھی۔ یہ مکمل تفسیر ہے یا جزوی؟ اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتاہے؛ جمیل نقوی نے اس کا شمار مکمل تفاسیر میں کیاہے جبکہ ڈاکٹر احمد خان نے اسے جزوی تفسیر قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

زبان کی بندش اور کلمات کے استعمال سے اندازہ ہوتاہے کہ یہ ترجمہ بیسویں صدی کے وسط میں چھپاہے۔

ڈاکٹر فریدہ خانم: ڈاکٹر فریدہ خانم بھی قرآن کریم کی مترجمہ ہیں۔ انھوں نے اپنے والد مولانا وحیدالدین خان مرحوم کے ترجمہ ''تذکیر القرآن'' کا انگریزی زبان میں The Quran - Explanatory Notes کے نام سے ترجمہ کیاہے۔ جو اشاعتی ادارے Good Word Books نئی دہلی سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ غیر مسلموں اور خصوصاً مغربی ممالک میں مقبول ہے۔

ڈاکٹر فریدہ خانم ۱۹۵۲ء میں اتر پردیش کے مردم خیز ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبہ اسلامیات کی سابق پروفیسر ہیں۔ انھوں نے بیچلر اور ماسٹر ڈگری دہلی یونیورسٹی سے حاصل کی، پھر ۱۹۹۰ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے اسلامک اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی

---

[۹] مقدمہ، تبیین القرآن فی تفسیر القرآن، بحوالہ خواتین اور خدمتِ قرآن، ص ۲۸۵

کی۔ڈاکٹر فریدہ خانم متعدد کتابوں کی مصنفہ اور اپنے والد کی کئی کتب کی انگریزی میں مترجمہ ہیں۔

ڈاکٹر شہناز شیخ اور کوثر کھتری: ڈاکٹر شہناز شیخ اور محترمہ کوثر کھتری نے مشترکہ طور پر تین جلدوں میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا ہے، جس کا نام یہ ہے:

The Glorious Quran: Word for Word Translation

یہ ترجمہ انگریزی زبان میں ہے۔اس کا مقصد انگریزی جاننے والوں کو براہِ راست عربی زبان سے متعارف کرانا ہے۔یہ قرآن کریم کا لفظی ترجمہ ہے۔ متن کے ساتھ تحت السطور میں ترجمہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ حاشیے میں پورا ترجمہ ایک ایک آیت کا نمبر ڈال کر لکھا گیا ہے۔جو لوگ عربی نہیں جانتے، عربی زبان سے نابلد و ناآشنا ہیں ان کے لیے یہ ترجمہ ایک عمدہ تحفے سے کم نہیں ہے کہ وہ لفظ بہ لفظ قرآن کو سمجھ سکیں اور اس کے مطالب پر غور کر سکیں۔ تین جلدوں پر مشتمل یہ ترجمہ ۲۰۱۳ء میں اسلامی کتاب گھر نئی دہلی سے شائع ہوا ہے۔ہر جلد میں دس پاروں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔

واحدہ خانم: واحدہ خانم ان مفسراتِ قرآن میں سے ایک ہیں جنھوں نے سورۂ فاتحہ اور پارۂ عمّ (تیسویں پارہ) کی تفسیر کی ہے۔ واحدہ خانم قرآنک کالج بنگلور کی پرنسپل تھیں۔انھوں نے ۱۹۳۶ء میں ''مطالب القرآن'' کے نام سے قرآن کریم کے تیسویں پارہ کا ترجمہ و تفسیر کیا۔

یہ تفسیر دو حصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ سورہ فاتحہ پھر الٹی ترتیب سے سورۂ ناس سے سورۂ فجر کی تفسیر پر مشتمل ہے، جبکہ دوسرے حصے میں سورۂ غاشیہ تا سورۂ نبا کا ترجمہ ہے۔ترجمہ بالکل عام فہم انداز میں ہے بلکہ ہر سورت کی ترجمانی کی گئی ہے۔ترجمہ اور تفسیر کا انداز یہ ہے کہ متنِ قرآن کے ساتھ اردو ترجمہ ہے پھر مطلب اور مفہوم کو واضح کیا گیا ہے۔یہ نہایت مختصر تفسیر ہے جو قومی پریس بنگلور سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

اس کے علاوہ محترمہ واحدہ خانم نے ''اساس القرآن'' کے نام سے ۱۹۴۶ء میں سورۂ فاتحہ کا ترجمہ کیا جو اس سورت کے معنی و مطالب پر مشتمل ہے۔اسے انھوں نے مسلم ویلوروی کے اشتراک سے لکھا ہے۔ایک سو باسٹھ صفحات اور سات ابواب پر مشتمل ہے۔یہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کی لائبریری اور ریختہ کی سائٹ پر موجود ہے۔

پروین خلیل: محترمہ پروین خلیل صاحبہ نے بچوں میں قرآن فہمی پیدا کرنے کے لیے بچوں کی ذہنی سطح کو پیش نظر رکھ کر اردو میں نہایت آسان زبان میں پارہ عم کے ترجمہ و تفسیر کا کام انجام دیا ہے۔پہلے آیت میں ہر لفظ کے علیحدہ معنی بیان کیے گئے ہیں پھر اس کا ترجمہ کرتے ہوئے تفسیر بیان کی گئی ہے۔اس

ترجمہ و تفسیر کی خاص بات یہ ہے کہ ہر سورت کی تفسیر کے بعد اس سورت سے متعلق کچھ سوالات کیے گئے ہیں تاکہ بچے قرآن کے پیغام کو بآسانی سمجھ سکیں۔

پارۂ عم کی مختلف سورتوں کو تین الگ الگ مندرجہ ذیل کتابی شکلوں میں تحریر کیا ہے:

۱۔ بچوں کے لیے پارہ عم کی دس سورتیں

۲۔ بچوں کے لیے پارہ عم کی بارہ سورتیں

۳۔ بچوں کے لیے پارہ عم کی پندرہ سورتیں

ان میں مؤخر الذکر (بچوں کے لیے پارۂ عمّ کی پندرہ سورتیں) دوسواٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں تعوّذ و تسمیہ کی تشریح کے بعد بالترتیب سورۂ نبأ تا سورۂ لیل نہایت آسان، عام فہم زبان اور سادہ انداز میں تشریح کی گئی ہے۔اس کی اشاعت اول ۱۹۹۷ء میں اور اشاعتِ دوم ۱۹۹۸ء میں عمل میں آئی۔اس کے پیش لفظ میں جناب مسعود جاوید ہاشمی نے لکھا ہے:

> ملت کے نونہالوں کے لیے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔تحفے تو شوکیس میں سجائے جاتے ہیں، مگر یہ تحفہ دل میں اترنے والا اور دماغ کو روشن کرنے والا ہے۔ بچوں سے بے پناہ محبت نے پروین خلیل صاحبہ کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کو بھی اس بڑی نعمت سے فائدہ اٹھانے کا سامان فراہم کریں۔اس میں ہر بات کو خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے: صحیح کیا ہے؟ غلط کیا ہے؟ اچھے اخلاق کیا ہیں؟ برے کیا ہیں؟ نیکی کیا ہے؟ بدی کیا ہے؟

بچوں کے لیے یہ تفسیر کتنی مفید ہے اس کا اندازہ پروین خلیل صاحبہ کے ان الفاظ سے لگایئے جو انھوں نے تعوذ کی تفسیر میں تحریر کیا ہے، لکھتی ہیں:

> قرآن شریف شروع کرنے سے پہلے اللہ میاں نے تاکید کی ہے کہ اللہ کی پناہ حاصل کرو شیطان سے، جو دھتکارا ہوا ہے۔ اس کے پڑھنے سے یہ فائدہ ہے کہ دل برے خیالات سے پاک ہو جاتا ہے۔بچو! یہ بات یاد رکھو کہ تعوذ پڑھنا صرف قرآن مجید کے ساتھ ضروری ہے۔ کسی اور کتاب یا قصہ کے ساتھ پڑھنا سنت کے خلاف ہے۔سنت اس کام کو کہتے ہیں جو پیارے نبی ﷺ نے خود کیے اور دوسروں کو کرنے کا حکم دیا۔[10]

یہ تفسیر بظاہر مختصر ہے لیکن بچوں کے مزاج کو دینی بنانے، بچوں میں قرآن پڑھنے اور سمجھنے کا شوق پیدا

---

[10] پارہ عم کی پندرہ سورتیں، بحوالہ خواتین اور خدمتِ قرآن، ص ۲۸۳

کرنے کے لیے بڑی اہم تفسیر ہے۔

ڈاکٹر ہادیہ شامخات مسعودی: ڈاکٹر ہادیہ شامخات مسعودی پیشہ سے ایم.بی.بی.ایس ڈاکٹر ہیں۔ پہلے انھوں نے صرف عصری تعلیم حاصل کی تھی، لیکن جب انھیں دینی تعلیم خصوصاً قرآن کریم سے تعلق پیدا ہوا تو دینی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئیں اور اپنی مصروفیات کے باوجود المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے زیر انتظام چلنے والے مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ سے پانچ سالہ عالمہ کا کورس کیا، پھر وہ اپنی پریکٹس کے ساتھ اسی مدرسے میں داخلہ لینے والی خواتین کو قرآن و حدیث کی تعلیم دینے لگیں۔

اسی مصروفیت کے زمانے میں انھیں یہ احساس ہوا کہ بہت سی خواتین چاہتے ہوئے بھی قرآن کریم کے صحیح معانی و مفاہیم سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے انھوں نے قرآنی الفاظ پر مشتمل ''کلیدِ الفاظ قرآنی'' کے نام سے ایک جامع ڈکشنری تیار کی جس میں مکمل قرآنی الفاظ کے معانی، مادے، صیغے اور ابواب کی تحقیق پیش کی گئی ہے۔ سب سے پہلے أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے لفظی معنی بیان کیے گئے ہیں، پھر سورۂ فاتحہ سے سورۂ ناس تک قرآن کے الفاظ کے معانی، لفظ کا مادہ، فعل، صیغہ، مصدر، باب واحد اور جمع بالترتیب بیان کیے گئے ہیں۔ ۵۸۴ صفحات پر مشتمل یہ ڈکشنری پہلی مرتبہ ۲۰۱۶ء میں کرسٹل پبلی کیشنز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز سے شائع ہوئی۔

ڈاکٹر ہادیہ نے اگرچہ عام دستور کے مطابق قرآن کریم کی تفسیر نہیں لکھی ہے لیکن لغت اور ڈکشنری کے طرز پر ایک نئے انداز سے کام کیا ہے جس کے سبب محترمہ ہادیہ بھی تفسیری خدمات انجام دینے والی خواتین کی فہرست میں شامل ہیں۔

یہ قرآن مجید کی خدمت کرنے والی ہندوستانی خواتین ہیں جن میں بعض نے خود تفسیر یا ترجمہ کیا ہے۔ بعض نے خود تو قرآن کی تفسیر یا ترجمہ نہیں لکھا لیکن اپنے وقت کے علماء اور فضلاء سے تفسیر یا ترجمہ لکھوا کر اپنا نام قرآن کی تفسیری خدمات کرنے والی خواتین کی فہرست میں درج کرایا ہے، جبکہ بعض خواتین نے مشترکہ طور پر بصد شوق قرآن کی خدمت کو اپنے لیے سعادت سمجھا۔ وہ تفسیری خدمات کے حوالے سے ہمیشہ یاد کی جائیں گی۔

ملی مسائل

زمینی حقائق کی روشنی میں اقدامات کریں

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
zik@zik.in

ہمارے یہاں دو طرح کی تقریریں ہوتی ہیں۔ایک مرثیہ خوانی ہوتی ہے جس میں ہم اپنی بے بسی اور اغیار کی سازشوں کا رونا روتے ہیں اور اپنی کمیوں، کوتاہیوں اور اپنے مسائل کی ذمے داری دوسروں کے سر پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ تقریریں مغرب اور اسرائیل کے خلاف ہوتی ہیں تو کبھی اپنے ملک میں شدت پسند غیر مسلمین کے بارے میں۔ ہماری دوسری تقریریں ہوش سے عاری، جوشیلی تقریریں ہوتی ہیں جن میں ہم دھواں دھار لفاظی کر کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں کہ ہم یہ کر دیں گے اور وہ کر دیں گے۔ لیکن یہ وقتی جوش جھاگ کی طرح ہوا میں بکھر جاتا ہے، بات وہیں ختم ہو جاتی ہے اور اصل مسئلے جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔ہماری تحریریں بھی کچھ اسی قسم کی ہوتی ہیں۔

یہ دونوں طریقے غلط ہیں اور کبھی بھی ہمیں اچھے نتائج کی طرف نہیں لے جا سکتے ہیں بلکہ یہ صرف ہماری بے بسی کو مزید اجاگر کرتے ہیں اور ہماری ہمت کو پست کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم کو حقیقت پسندی کے ساتھ اپنے حالات، اپنی قوت اور اپنی کمیوں کا جائزہ لینا چاہئے اور قوم کے سامنے ایک عملی لائحۂ عمل رکھنا چاہئے جس سے مستقبل بعید میں ہمارے حالات بہتر ہو سکیں۔اس قسم کے حقیقت پسندانہ جائزے کا لازماً حصہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ ہمیں اپنے حالات کو بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔اس نقطۂ نظر سے جب ہم اپنے حالات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو لگتا ہے کہ ہم مسلسل کئی صدیوں سے اپنے مسائل کا علاج غلط طریقے سے کر رہے ہیں۔

پچھلی تین صدیوں سے حالات کی ڈور دھیرے دھیرے ہمارے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ہر اگلا سال پچھلے سال سے مزید خراب ہوتا ہے۔اس کے کچھ بنیادی اسباب ہیں۔اس میں نمبر ایک بدلتے ہوئے حالات کو نہ سمجھنا اور بالخصوص جدید تعلیم کو نہ اپنانا ہے۔اس میں دوسرا مسئلہ اپنے ماحول کو سمجھنے میں غلطی اور باہر سے مدد کی خواہش ہے۔ تیسرا مسئلہ اپنے ملک کے اندر موجود اکثریت سے عمدہ تعلقات قائم کرنے میں ناکامی اور چوتھا مسئلہ آپس میں اتحاد کا فقدان ہے۔ یہ سب وجوہات مل کر ایک

ایسا معجون مرکب (کوکٹیل) بناتے ہیں جس کے نتیجہ میں ہم کو وہی ملنا چاہئے تھا جس سے ہم آج یا کم از کم ۱۹۴۷ سے دوچار ہیں۔

آیئے اپنے ماضی قریب پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ جب آکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹیاں بن رہی تھیں، اس وقت ہمارے ملک میں شاہ جہاں اپنی بیوی کے لئے تاج محل بنوا رہا تھا اور اپنے دربار کے لئے تختِ طاؤس جس کی لاگت آج کے لحاظ سے ایک ہزار ملین ڈالر تھی۔ اس جیسا مہنگا فن پارہ artefact سن ۱۰۰۰ء اور ۱۹۹۹ء کے درمیان یعنی ایک ہزار سال کے دوران نہیں بنا۔ اس وقت پرتگالی سمندروں پر قابض ہو رہے تھے اور سمندروں پر ہمارے تجارتی قبضے کو ملیامیٹ کر رہے تھے، لیکن بے تحاشا مادی دولت ہونے کے باوجود مغلوں نے سمندری بیڑہ نہیں بنایا۔ مختلف یوروپین ملکوں کے لوگ ہمارے ملک کے مختلف حصوں پر دھیرے دھیرے قابض ہو رہے تھے۔ ان میں پرتگالی، فرانسیسی، ولندیزی اور انگریز شامل تھے۔ ہم نے ان کو بڑا مسئلہ نہیں سمجھا یہاں تک کہ وہ سیاسی حکمراں بن بیٹھے اور تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ پرنٹنگ پریس کے ذریعے یوروپ میں پندرہویں اور سولہویں صدی میں اُسی طرح کا معلوماتی اور علمی انقلاب آرہا تھا جیسا آج انٹرنٹ کے ذریعے آیا ہے۔ لیکن اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگزیب کو پرنٹنگ پریس کا خیال نہیں آیا جبکہ ترکوں نے اس کو عرصۂ دراز تک حرام قرار دیا۔ میگناکارٹا (۱۲۱۵ء) اور فرانسیسی انقلاب (۱۷۸۹ء) کے ذریعے ایک نیا سیاسی انقلاب آرہا تھا جس میں حاکم کے بجائے افراد یا سروں کی قوت اور اہمیت ہوتی ہے۔ اس وقت ہمارے حاکموں نے صرف اشارہ کیا ہوتا تو سارے دلت، ادیواسی اور قبائلی مسلمانوں ہو گئے ہوتے اور آج کے جمہوری کھیل میں ہم بازی نہ ہارتے۔

ہر نتیجہ، صحیح یا غلط، کسی صحیح یا غلط عمل کی پیداوار ہوتا ہے۔ کیا آج جو ہماری اتنی بڑی کمیونٹی کے ساتھ ہو رہا ہے وہ صرف دوسروں کی مکاری اور سازش ہے؟ نہیں! ہماری پچھلی دو تین سو سال کی تاریخ حماقتوں سے بھری ہوئی ہے۔ انگریزوں کے پیر جمانے میں ہماری حماقتوں اور غداریوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ جنوبی ہند اور بنگال میں انگریزوں کی کامیابیوں میں کچھ مسلمانوں اور ہمارے ہم وطن لوگوں کی غداریوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ پھر جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو نکال پھینکنے کا وقت آیا تو اس وقت بھی ہمارے کچھ لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور یہ وہ ۵۲۰ نواب اور راجہ مہاراجہ تھے جن کی حکومتیں ۱۹۴۷ تک قائم رہیں۔ خود ۱۸۵۷ کے مجاہدین کی صفوں میں غدار موجود تھے جو انگریزوں کو پل پل کی خبریں پہنچا رہے تھے اور اندر سے انقلاب کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ یہی نہیں بلکہ خود مجاہدین کے درمیان اقتدار

کی لڑائی ہو رہی تھی کہ کون فوج کا کمانڈر بنے اور مالیات کس کے پاس ہو۔

۱۸۵۷ کی تحریک کی ناکامی کے بعد ایک حقیقی مرد مجاہد سید احمد خان نے بڑی محنت کر کے انگریزوں کا غصہ ٹھنڈا کیا، مسلمانوں کو ایک نئے تعمیری راستے پر ڈالا اور ان کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا، جس کی وجہ ان کو اپنی ہی قوم سے گالیاں اور چپل کھانے پڑے۔ ان کا بنایا ہوا کالج آج ایک بڑی یونیورسٹی میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اس مثبت تحریک کا اثر پورے برّصغیر پر پڑا اور ایک طرح کی تبدیلی آئی لیکن وہ تبدیلی مکمل نہیں تھی۔ اس کے بعد بھی ہمارا مذہبی حلقہ انگریزی زبان اور جدید علوم کو حرام ہی کہتا رہا۔

۱۸۵۷ اور اس بعد کے سالوں میں بری طرح پٹائی کے باوجود ہماری قوم جوشیلے لیڈروں کے پیچھے تب سے اب تک بھاگ رہی ہے۔ کبھی ۱۹۲۰ کی تحریک ہجرت تو کبھی تحریک خلافت تو کبھی تحریک پاکستان اور آزادی کے بعد تحریک شاہ بانو اور بابری مسجد کی تحریک........ یہ سب جوشیلی تحریکیں تھیں جن کا زمینی حالات اور حقائق سے بہت کم تعلق تھا۔

میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا ہوں کہ شاہ بانو اور بابری تحریکوں کا جو حشر ہوا وہی ہونا چاہئے تھا۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہم کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ سیاسی اور قانونی حقوق زمینی حقائق سے الگ وجود نہیں رکھتے ہیں۔ ان مسائل کو کسی اور طریقے سے سڑک سے دور حل کرنا چاہئے تھا۔ شروع میں بابری مسجد کا مسئلہ ٹھنڈے طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہوتی جس میں مسلمانوں کی سبکی نہ ہوتی۔ باہمی بات چیت کے علاوہ عدالتی کارروائی کا راستہ بھی کھلا ہوا تھا۔ لیکن جذباتی اور جوشیلے قائدین نے ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور سڑک کا راستہ اپنایا جس میں ہمارے کامیاب ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ اگر ہم ایک لاکھ لوگ جمع کریں گے تو دوسرا فریق دس اور بیس لاکھ جمع کر سکتا ہے۔ بالآخر جب انھوں نے چھ لاکھ لوگ جمع کئے اور مسجد توڑ دی تو ہمارا ایک آدمی بھی وہاں نہیں پہنچا۔ نتیجتاً ہمیں ایسی ناکامی ملی ہے کہ ہم سر اٹھانے اور بولنے کے بھی قابل نہیں رہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری ماضی کی جوشیلی تحریکوں نے ہمارے مسائل کو سلجھانے کے بجائے صرف مزید الجھایا۔ تحریک ہجرت سے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ قوم کو مزید خواری ملی۔ تحریک خلافت سے ترکی میں خلافت کی حفاظت نہیں ہوئی بلکہ ہماری طاقتوں اور سرمائے کا برسوں غلط استعمال ہوا اور بالآخر وہ تحریک ہم کو شکست خوردہ کر کے چھوڑ گئی جبکہ "خلافت ہاؤس" آج بھی بمبئی اور کلکتہ میں موجود ہیں۔ تحریک پاکستان نے ہندوستانی مسلمانوں کو نہ صرف تین ٹکڑوں میں بانٹ دیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے مقدر میں ہمیشہ کے لئے ذلت و خواری لکھ دی۔ تقسیم کے ۷۵ سال کے بعد

بھی آج تک ہم اس خواری اور خلا سے نہیں نکل پائے ہیں جو تقسیم کا لازمی نتیجہ ہونے والا تھا لیکن ہم میں بہت ہی کم ایسے بینا لوگ موجود تھے جو آنے والے دنوں کا تصور کر سکتے۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد سر فہرست تھے لیکن ہم نے ان کی نہیں سنی۔ تقسیم کے بعد بھی ہم نے اپنے ہم وطنوں سے عمدہ تعلقات بنانے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ سال، دو سال میں کوئی کانفرنس منعقد کرنے سے عمدہ تعلقات قائم نہیں ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے لئے ہر روز جہدِ مسلسل درکار تھی اور کچھ لوگوں کو اس کام کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دینی چاہئے تھیں اور ملت کو ان کی کفالت کرنی چاہئے تھی۔

نئے ہندوستان میں ملک کی تقسیم اور نفرت کی سیاست کی وجہ سے جو سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال بنی تھی اور جس طرح ہم ہر طرح سے حاشیے پر آگئے تھے، اس کی وجہ سے جذباتی سیاست کی ناکامی نوشتۂ دیوار بن چکی تھی اور ہمیں کوئی اور طریقہ اپنانا چاہئے تھا جیسے جاپان اور جرمنی نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنایا۔ ان دونوں ملکوں نے امریکہ کے خلاف مزاحمت یا جنگ جاری رکھنے کے بجائے اپنے ملک کی تعمیرِ نو کے فیصلے سے اپنی تقدیر چند دہوں میں بدل دی۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ایسی دوررس قیادت نہیں تھی جو ہم کو تعلیم اور معاشیات کی طرف موڑتی اور ٹکراؤ اور جذباتی سیاست سے دور رکھتی۔ نتیجۃً ہم جذباتی سیاست کا شکار ہو کر اِس بند گلی سے اُس بند گلی کا چکر لگاتے رہے اور آج بھی ہم منزل سے دور وہیں چکر لگا رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے کوئی ترقی کی ہے تو وہ افراد کی اپنی ذاتی سوجھ بوجھ اور پہل کی وجہ سے ہے، ہماری قیادت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

ہماری اِس جذباتی سیاست سے، نفرت کی اُس سیاست کو بھی تقویت ملتی چلی گئی جو ملک کے دستوری ڈھانچے کے بدلنے کے درپے ہے اور مسلمانوں کو دوسرے نمبر کا شہری بنانا چاہتی ہے، حالانکہ اب بھی ہمارے ملک میں ایسے بہت سے انصاف پسند لوگ موجود ہیں جو قانون اور دستور کی حمایت میں کھڑے ہوئے ہیں لیکن ان کی تعداد بھی روز بروز کم سے کم تر ہوتی چلی جارہی ہے۔

اپنے حقوق کے لئے اور مظالم کے خلاف اداروں اور عدالتوں کے ذریعے ہماری حقوق کی لڑائی قانون کے تحت جاری رہنی چاہئے۔ میڈیا، تحقیقاتی اداروں اور تھنک ٹینکس کو قائم کر کے ہمیں اپنی قوت اور آواز مضبوط کرنی چاہئے۔ یہ وہ میدان ہیں جہاں ہم تقریباً صفر ہیں۔ لیکن یہ کام بھی کچھ افراد اور کچھ تنظیمیں ہی کریں گی، ہم پوری قوم کو ہم ان امور پر سڑکوں پر نہیں لائیں گے اور نہ ہی علانیہ کسی کے خلاف سب و شتم کے مرتکب ہونگے۔ اس قانونی لڑائی میں ہم سماج کے ایک بڑے حصے کو دشمن نہیں

بنائیں گے۔ ہم کو سماج کی تمام نمائندہ طاقتوں اور پارٹیوں کے ساتھ تعلقات، بات چیت اور ڈائیلاگ جاری رکھنا چاہئے۔ اس میں وہ بھی شامل ہیں جو ہم کو یا ہم ان کو دشمن سمجھتے ہیں۔ سیاست میں کوئی اچھوت نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اس حکمتِ عملی پر عمل کرنا چاہئے۔

ہمارے ساتھ یہ مسئلہ بھی رہا ہے کہ جن مسائل کے بارے میں ہمارا خیال ہے کہ وہ براہ راست ہم پر اثر انداز ہوتے ہیں، ہم انھیں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ سماج میں جو دوسرے مسائل ہیں اور جو اور زیادتیاں ہو رہی ہیں ہمیں ان سے سروکار نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں یہ رویہ بدلنا ہوگا اور ہمیں ان سارے مسائل میں دلچسپی لینی ہوگی جن کا ملک کے حاضر اور مستقبل سے تعلق ہے۔

آج کے زمانے میں کوئی قوم دو چیزوں کے بغیر سر اٹھا کر نہیں جی سکتی۔ ایک ہے تعلیم اور دوسرا ہے بزنس میں حصہ داری۔ ہم ان دونوں میدانوں میں انتہائی پیچھے ہیں۔ بزنس یعنی تجارت میں ہمارا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ چھوٹی چھوٹی دکانوں اور خوانچوں میں تو ہم بہت آگے ہیں لیکن بڑی تجارتیں، بڑی کمپنیاں اور بڑی فیکٹریاں ہماری پہنچ سے باہر ہیں۔ ایک قوم جس کی تعداد ہندوستان میں محض ۷۰ ہزار ہے، یعنی پارسی قوم، تجارت میں ۲۰۰ ملین مسلمانوں سے کہیں آگے ہے اسی لئے اس کا بہت احترام بھی ہوتا ہے۔ حکومت ہند، جو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پریشان ہے، یہ ریسرچ کرا رہی ہے کہ پارسیوں کی تعداد کیسے بڑھائی جائے!

کسی بڑی مسلم تنظیم نے تعلیم اور بزنس کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وہ دو طاقتیں ہیں جو مادی دنیا میں کسی قوم کو سرخرو اور طاقت ور بناتی ہیں۔ ملک کے باہر یہودی اور ملک کے اندر پارسی اس کی مثال ہیں۔ جو جدید تعلیمی ادارے ہماری قوم نے پچھلے دو سو سالوں میں بنائے تھے، آج ان کی بری حالت ہے۔ کم از کم شمالی ہندوستان میں یہی حالت ہے، جبکہ کیرالا میں حالات بہتر ہیں اور اسی لئے کیرالا کے مسلمانوں کی حالت بھی مجموعی طور پر بہت بہتر ہے۔ ہمارے مسلم اسکولوں اور کالجوں کی حالت انتہائی خراب ہے۔ آپس میں لڑائی اور گروپ بندی کی وجہ سے تعلیمی معیار بہت گر گیا ہے۔ پھر ہمارے بچے کیسے ان اسکولوں میں عمدہ تعلیم حاصل کر سکیں گے؟ نتیجۃً جو بھی برداشت کر سکتا ہے وہ اپنے بچے کو دوسروں کے اسکولوں میں بھیجتا ہے۔

تعلیم اور بزنس پر توجہ دیجئے۔ عمدہ اسکول کھولئے۔ جو مسلم اسکول آپ کے علاقوں میں کھلے ہوئے ہیں ان کی بہتری کے لئے مہم چلایئے تاکہ رسّہ کشی والی کیفیت ختم ہو اور تعلیم پر توجہ مرکوز ہو۔ ''یونیورسٹی'' قائم کرنے کی مت سوچئے۔ آج ہم کو اچھے اسکولوں کی ضرورت ہے۔ اگر ہمارے بچے

اسکولوں میں اچھی تعلیم نہیں حاصل کریں گے تو وہ یونیورسٹیوں میں کیسے جائیں گے؟

تعلیمی طور سے ہندوستان کے مسلمان دوسرے گروپوں سے پیچھے ہیں۔ ہمارا ۴۰۔۴۵ ؍ فیصد معاشرہ ناخواندہ ہے۔ اسکول چھوڑنے والے یعنی ڈراپ آؤٹ ہونے والے بچوں کا تناسب ہمارے یہاں سب سے زیادہ ہے جبکہ ہمارا دین روز اول سے علم حاصل کرنے کی ہمیں تلقین کر رہا ہے۔ علم میں یقیناً دینی علوم شامل ہیں لیکن دوسرے دنیاوی علوم بھی اسی طرح اہم ہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے ہم سے کہا کہ ''علم حاصل کرو چاہے چین میں ہی کیوں نہ ہو'' تو اس کا مطلب دینی علوم تو نہیں تھے۔ ہمارا فرض ہے کہ زمانے اور حالات کے لحاظ سے جو علوم بھی مطلوب ہوں ان کو سیکھیں اور ان میں امتیاز حاصل کریں۔ ہمارے قدیم مدارس میں دینی علوم اور دنیاوی علوم کی تفریق نہیں تھی بلکہ وہیں سے مفسر اور عالم حدیث پیدا ہوتے تھے اور اُنھیں مدرسوں سے ریاضیات، فلک اور طب کے ماہرین بھی نکلتے تھے۔ مغربی سامراج کے آنے کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹا اور مسلمانوں نے ایسے پرائیویٹ مدرسے بنانے شروع کر دئے جہاں صرف دینی کیا بلکہ صرف مسلکی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس بنیاد پر شروع کیا گیا تھا کہ کہیں سرکاری مدارس کے ذریعے سامراجی حکمراں ہمارے دین میں بھی دخل اندازی نہ شروع کر دیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ پرائیویٹ مدرسے اور ان کا نظامِ تعلیم مقدس ہو گئے ہیں۔ اب ان میں کسی تبدیلی کی بات کی جاتی ہے تو دین خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

مدارس کے نصاب کی اصلاح کی باتیں تقریباً ایک صدی سے چل رہی ہیں لیکن عملاً کوئی اصلاح بہت کم اور بہت دیر میں آتی ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ یہ مدارس دینی اور عصری دونوں تعلیم دیتے اور ان سے نکلنے والا نوجوان ہائی اسکول اور سینئر سیکنڈری اسکول کے سرٹیفکٹ لے کر باہر نکلتا۔ آج ہمارا نوجوان مدرسے سے جو سند لے کر نکلتا ہے اس کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں۔ وہ صرف امام، مؤذن یا کسی مدرسے میں تدریس کے لائق ہوتا ہے۔ اگر وہ زیادہ تیز وطرار ہوتا ہے تو ایک اور مدرسہ کھول لیتا ہے۔ اس کے علاوہ چند سو فارغین مدارس بعض ہندوستانی یونیورسٹیوں میں داخلے لے کر انسانیات کے کچھ کورس کر لیتے ہیں یا ان میں سے دس، بیس بعض عرب یونیورسٹیوں میں داخلے پا جاتے ہیں۔ لیکن ان فارغین مدارس کی اکثریت عظمی حاشیے پر زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ آپ میں سے بہت سے ہوں گے جو مدارس کی مدد کرتے ہیں۔ آپ ضرور مدد کریں بلکہ مدد میں اضافہ کریں لیکن مدارس کے ذمے داروں پر یہ بھی زور ڈالیں کہ وہاں جدید علوم کی تعلیم بھی ہو اور بچے آخر میں ایک ایسا سرٹیفیکیٹ لے کر نکلیں جس کو دنیا تسلیم کرتی ہو۔ جمعیت علماء ہند نے اس سلسلے میں پہل کی ہے کہ ان کے مدارس میں نیشنل

اوپن اسکول NIOS کا نصاب بھی پڑھایا جائے گا تاکہ ان کے بچے اس ذریعے سے سکنڈری اور ہائر سکنڈری اسکول کے سرٹیفیکیٹس لے کر نکلیں۔ یہ اچھی ابتدا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے دینی مدارس پوری طرح سے جدید نظام تعلیم سے جڑیں اور دین کے علاوہ دنیا کی بھی معیاری تعلیم اپنے طلبہ کو دیں۔

بزنس کی طرف بھی پوری توجہ دیجیے تاکہ قوم کے ہاتھ میں پیسہ آئے اور ہم وہ سب کام کر سکیں جو آج ہونے چاہئیں لیکن نہیں ہو پا رہے ہیں، جیسے میڈیا ہاؤسز، تھنک ٹینکس اور ریسرچ سنٹرز وغیرہ کا قیام۔ لیکن یہ ضروری کام ہم نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ اس طرح کے کسی بڑے کام کے لئے ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہے۔

آج ہماری جو صورت حال ہندوستان میں ہے، ہم اپنی نااہلی، بدعملی، لاعملی اور جوشیلے اقدامات کی وجہ سے اس کے پوری طرح ذمے دار ہیں۔ دوسری قوموں، خصوصاً ہندوؤں سے، ہمارا کوئی خاص ربط و تعامل نہیں رہا جس کی وجہ سے دوریاں اور ایک دوسرے کے خلاف شک وشبہات بڑھتے چلے گئے۔

فی الحال جو پاگل پن ہندوستان میں برپا ہے وہ ایک دن میں وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ اس کا تعلق ہماری لمبے عرصے کی غلطیوں اور خامیوں سے بھی ہے۔ آج یہ طوفان ساری حدود کو پار کر چکا ہے۔ اس کا مقابلہ ہم انھیں کے حربوں سے نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ ہمارے پاس پیسے، ایڈمنسٹریشن، پولیس اور میڈیا کی طاقت نہیں ہے جبکہ دوسرے فریق کے پاس یہ طاقتیں پوری طرح موجود ہیں۔

اب بھی ضرورت ہے کہ ہم اکثریت کے ساتھ محبت اور تفاہم کے پل بنائیں اور ان کو اپنا ہمنوا بنائیں۔ اچھے لوگوں کی آج بھی ہندوستان میں کمی نہیں ہے۔ نفرت کی سیاست کرنے والے ملک کی اکثریت نہیں ہیں۔ ۲۰۱۴ کے انتخابات میں بی جے پی کو صرف ۳۱ فیصد ووٹ ملے تھے اور ۲۰۱۹ کے الیکشن میں اس کو صرف ۳۹ فیصد ووٹ ملے تھے یعنی اکثریت نے ان کو ووٹ نہیں دیا تھا۔ ان کو ووٹ دینے والوں میں ایسے بہت ہیں جو ’’وکاس‘‘ کے نعرے سے بے وقوف بنے تھے جبکہ نفرت کی سیاست کے ہمنوا شاید ۱۰-۱۵ فیصد سے زیادہ نہیں ہیں۔ نفرت کے اس پاگل پن اور طوفان کو ہم دنیا کے سامنے ننگا کر کے روک یا کم کر سکتے ہیں۔ یہ طریقہ advocacy کا ہے جس کو دوسرے لوگ، بالخصوص ہندوستان کی عیسائی کمیونٹی، کامیابی سے اپنائے ہوئے ہے۔ یہ کام سنجیدہ کتابوں، تحقیقاتی رپورٹوں، ڈاکیومنٹری فلموں اور حقوق انسانی کے عالمی اداروں اور تنظیموں سے رابطہ کر کے ان کو صحیح معلومات پہنچا کر کیا جا سکتا ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ ہمارے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ دنیا میں، بالخصوص اقوام متحدہ،

امریکہ اور یورپ میں ایسے متعدد ادارے ہیں جو ان امور پر نظر رکھتے ہیں اور ان پر بر وقت رائے دیتے ہیں جس کا بین الاقوامی اثر ہوتا ہے اور وہ ہماری حکومت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انٹرنٹ اور سوشل میڈیا کے ذریعے اپنی آواز پھیلائیے۔ مظالم کے بارے میں باہر کے لوگوں کو معتدل انداز سے باخبر کیجئے۔ یہ اگرچہ ایک وقتی کام ہے لیکن فی الحال بہت اہم ہے کیونکہ ملک کے اندر جو پاگل پن اس وقت چل رہا ہے، اس پر بیرونی دباؤ سے بڑی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس کام میں اگر کوئی سنجیدہ لوگ مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

جو پاگل پن ہمارے ملک میں فی الحال جاری ہے وہ ہمیشہ نہیں رہے گا بلکہ ایک دن ختم ہو گا۔ یہی اللہ پاک کا قانون ہے ورنہ فرعون وہامان، نمرود و شداد اور ہٹلر و موسولینی آج بھی زندہ ہوتے۔ اس پاگل پن کے جلد خاتمے کے لئے ہم کو یہ پلاننگ کرنی ہے کہ مستقبل میں ہم کس طرح سر اٹھا کر ہندوستان میں جیئیں گے اور اپنے جائز حقوق حاصل کریں گے؟ اس کے لئے ہم کو وہی طریقہ اپنانا ہے جو دوسری قومیں کرتی ہیں۔ اس پلاننگ میں تعلیم نمبر ایک پر ہے۔ اس میں دینی اور دنیاوی تعلیم دونوں شامل ہیں۔ دینی تعلیم کا مطلب مسلکی تعلیم نہیں، جو ہمارے مدارس میں رائج ہے، بلکہ وہ تعلیم ہے جس سے دین کی حقیقت اور روح معلوم ہوتی ہے اور جس کو پڑھ کر اور جان کر آدمی سچا مسلمان بنتا ہے اور دارین میں سرخرو ہوتا ہے۔ اور جدید تعلیم وہ ہے جس سے دنیا میں دوسری قومیں آج ترقی کر رہی ہیں۔

آج آئی ٹی کا زمانہ ہے جس کا زندگی کے ہر شعبے میں دخل ہو گیا ہے۔ جو قوم بھی اس میں آگے ہے وہی آج ترقی کر رہی ہے اور جو قومیں پیچھے ہیں وہ دوسروں کی دست نگر ہیں۔ اس کے لئے کوئی ایک بڑا کارخانہ نہیں بنتا ہے بلکہ لاکھوں لوگ ہزاروں ریسرچ انسٹی ٹیوٹس، کمپنیوں، آفسوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں اور ان کا مجموعی نتیجہ ان کی سوسائٹی اور ملک کو سرخرو بناتا ہے۔

صحیح معنوں میں ہم نے اپنا یہ سفر اب بھی شروع نہیں کیا ہے۔ کچھ افراد کے اس طرح کی تعلیم حاصل کر لینے سے پوری قوم کی حالت نہیں بدلے گی بلکہ لاکھوں لوگوں کو اس طرف متوجہ ہونا ہو گا اور اس اجتماعی کوشش سے ہی ہماری صورتحال بدلے گی۔ جس دن ہم یہ کرلیں گے یعنی تعلیم اور بزنس میں صف اول میں آجائیں گے تو ہمارے سارے مسائل بھی خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

یہاں میں ایک اور بات آپ سے کرنا چاہتا ہوں اور یہ صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو آج بالخصوص خلیجی ممالک میں مقیم ہیں۔ خلیج کا راستہ ہمارے لئے تقریباً ۴۰ سال پہلے کھلا ہے۔ اس سے ہمارے لاکھوں خاندانوں کے حالات بہتر ہوئے ہیں۔ ٹوٹے مکانات کی مرمت ہوئی ہے اور بچوں نے تعلیم پایا

شروع کیا ہے۔ یہ ایک خوش آیند بات ہے، لیکن اس کا ایک تاریک پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس طرح آنے والی دولت کا ہم نے صحیح استعمال نہیں کیا۔ گاؤں اور چھوٹے شہروں میں عالیشان مکان بنانا، ان کو ہر طرح کی آسائش سے مزین کرنا، گھروں کے باہر عمدہ گاڑیوں کا کھڑا کرنا، شادی بیاہ پر بے تحاشا خرچ کرنا ہماری دولت کا صحیح استعمال نہیں ہے۔

دولت کا صحیح استعمال یہ ہے کہ آپ خود پیش بینی کر کے وطن میں اپنے لئے املاک assets بنائیں جیسے اسکول، کالج، فیکٹریاں، دوکانیں وغیرہ جو بعد میں آپ کے کام آئیں گی کیونکہ خلیج کی نوکریاں ہمیشہ کی نہیں ہیں اور ایک نہ ایک دن آپ کی اکثریت کو یہاں سے واپس جانا ہے۔ آپ یہ غلطی نہ کریں کہ جو بھی آرہا ہے وہ خرچ ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا بلکہ جب آپ واپس جائیں گے تو خود کو بے دست و پا پائیں گے۔ میں نے یہ غلطی کی تھی۔ میں نے کافی عرصے باہر نوکری کی۔ میں اپنے ضروری خرچ کے علاوہ سارے پیسے ہر ماہ اپنے گھر بھیج دیتا تھا۔ سالوں بعد جب میں نوکری چھوڑ کر واپس گیا تو دیکھا کہ میرے اکاؤنٹ میں ایک روپیہ بھی نہیں ہے اور کچھ نہیں معلوم ہوا کہ نکالا ہوا پیسہ کہاں گیا۔ آپ اپنے گھر والوں کی ضرور مدد کریں لیکن اپنے مستقبل کی بھی روزِ اول سے فکر کریں اور یہ سمجھ لیں کہ ایک دن آپ کو وطن واپس جانا ہے اور اس وقت آپ کے ہاتھ میں کچھ ایسا املاک ہونے چاہئیں جو آپ کی ضروریات کے لئے کافی ہوں۔ اسی کے ساتھ آپ کا یہ فرض بھی ہے کہ ملت کے اداروں، اسکولوں، مدرسوں، یتیم خانوں وغیرہ کی حتی المقدور مدد کریں کیونکہ یہ ادارے آپ کی قوم کے لئے ہیں اور وہ قوم کے پیسے سے ہی چل سکتے ہیں۔ یہ ادارے بہت بڑی ضرورت پوری کر رہے ہیں۔ ان کی مدد کرنا فرض کفایہ ہے۔ اگر کوئی مدد نہیں کرے گا تو پوری قوم گنہگار ہوگی۔

آپ میں سے بہت سے لوگ ہندوستان میں پیسہ انوسٹ کر رہے ہوں گے یا کرنا چاہتے ہوں گے۔ آپ یہ کام ضرور کریں بلکہ اپنی آمدنی کا ایک مقررہ حصہ جیسے ۲۰ فیصد اس کام کے لئے مقرر کر لیں اور صرف ایسے مالیاتی اداروں میں کریں جو اچھے فنڈ چلا رہی ہوں اور جن کو حکومت ہند کی طرف سے بزنس کرنے کی اجازت ملی ہو۔ ہمارے یہاں کافی دنوں سے اسلامی بینکنگ یا اسلامی فائننس کمپنیوں کا شور وقتاً فوقتاً اٹھتا رہتا ہے۔ یہ کمپنیاں ملک میں مسلمانوں کو اور بیرون ملک آپ جیسے لوگوں کو شکار بناتی ہیں۔ یہ ہمارے پیسوں کو لوٹنے والی کمپنیاں ہیں جیسے المیزان اور الفلاح نامی ادارے جن کو ہمارے بعض مفتیان نے فتوے بھی دے رکھے تھے۔ ایسی کمپنیوں میں ہزاروں کروڑ کھونے کے باوجود ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا بلکہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ابھی کچھ عرصہ قبل نوھیرہ شیخ نامی عورت نے بھی

مسلمانوں کے ہزاروں کروڑ روپۓ اسلامی فائننس کے نام پر تباہ کئے۔ ایسی فراڈ کمپنیوں سے بچیۓ لیکن اسی کے ساتھ اپنی بچت کا ایک حصہ عمدہ اسکیموں میں انوسٹ کرنا نہ بھولئے۔ اپنے مستقبل اور اپنے بچوں کی بہبود کے لئے ایسی پلاننگ آپ کے لئے ضروری ہے۔

آج ہمارے پاس جو پیسے بھی ہیں ہم ان کو غلط رسوم بالخصوص شادیوں پر بے تحاشہ خرچ کر کے اڑا رہے ہیں بلکہ اس کی وجہ سے بہت سے لوگ بری طرح مقروض ہو رہے ہیں اور آباء واجداد کی جائدادوں کو بلا وجہ کے دکھاوے کے لئے فروخت کر رہے ہیں۔ جن کے پاس ذرا سے پیسے ہیں وہ دکھاوے کے لئے بار بار حج اور عمرے کر رہے ہیں حالانکہ ہمارے یہاں، غرباء، مدارس اور یتیم خانے وغیرہ بہت بری حالت میں ہیں۔ صرف فیس نہ دے پانے کی وجہ سے لاکھوں لوگ اپنے بچوں کو ہر سال اسکولوں سے نکال لیتے ہیں۔ کیا یہ ہماری ذمے داری نہیں ہے کہ ہم ایسے بچوں کی کفالت کریں؟ آپ اپنے علاقے سے شروعات کیجئے اور حتی المقدور ایک، دو، تین بچوں کی فیس براہِ راست ان کے اسکولوں میں جمع کرائیے۔ پڑھ لکھ کر ایسے بچے قوم کے لئے بڑا سرمایہ بنیں گے اور نہ پڑھ لکھ کر آسانی سے غلط راستوں پر پڑ جائیں گے اور ملت کے لئے سبکی کا سبب بنیں گے۔

میں نے ابھی تعلیم اور بزنس کا ذکر کیا جن کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے لیکن میرے نزدیک ہمارے سارے مسائل میں سرِ فہرست ہماری اخلاقی تنزلی کا مسئلہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عمدہ اخلاق کے حامل لوگ آج بھی ہماری سوسائٹی میں موجود ہیں لیکن عمومی حالت اخلاقی تنزلی کی ہے۔ آج ہماری عمومی حالت یہ ہے کہ دیگر اقوام کی بہ نسبت ہم میں اخلاقی ابتری زیادہ ہے۔ جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا، وعدہ خلافی کرنا ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔ اور یہی وہ صفات ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی ایک خصلت بھی کسی آدمی کے اندر ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے اور اگر یہ تینوں خصلتیں کسی انسان میں پائی جائیں تو وہ پورا منافق ہے۔ یہ گویا ایک معیار ہے جس سے ہم ناپ سکتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں یا نہیں ہیں۔ ہمارے لئے یہ بہت تشویش کا مقام ہے کہ ہماری کثیر آبادی میں یہ تینوں بری خصلتیں موجود ہیں جن کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے پندرہ سو سال قبل وارننگ دے دی تھی کہ جن میں یہ خصلتیں ہوں وہ منافق ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ منافق کا آخری مقام جہنم ہے۔ یہ مسئلہ ہمارے لئے سر فہرست ہونا چاہئے کہ کس طرح مسلمانوں کی اخلاقی ابتری کو سدھارا جائے اور ان کو اللہ پاک سے ڈرنے والے بندے بنایا جائے جو بڑے سے بڑے دنیاوی فائدے کے لئے بھی نہ جھوٹ بولتے ہوں، نہ وعدہ خلافی کرتے ہوں اور نہ

امانت میں خیانت کرتے ہوں۔

اس اخلاقی ابتری کی ایک بڑی وجہ ہمارا کلام اللہ یعنی قرآن پاک سے دور ہونا ہے۔آج اکثر ہندوستانی مسلمان قرآن پاک نماز میں یا ثواب کے لئے بغیر سمجھے ہوئے پڑھتے ہیں لیکن اُس ابدی ہدایت کے لئے نہیں پڑھتے ہیں جس کے لئے ہمارے اکثر لوگوں کو قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنا چاہئے جو ہماری تقریباً تمام زبانوں میں میسر ہے۔ قرآن پاک کے ذریعے اللہ پاک ہم سب سے ذاتی طور پر مخاطب ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اللہ کا پیغام، اللہ کی کتاب سے نہیں بلکہ کچھ مولویوں سے حاصل کرتے ہیں جو کلام اللہ کے بجائے دین کو بعض فقہی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کی جرأت تو اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ عوام کو قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے سے ہی منع کرتے ہیں کیونکہ انکے خیال میں عوام اس سے گمراہ ہو جائیں گے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک زندہ کلام کو چھوڑ کر ہم کچھ مولویوں کی خود ساختہ آراء کو سنتے ہیں اور ان سارے تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کو ان کے مسلکی مدرسوں میں رٹائے جاتے ہیں۔

مسجدوں کا مسئلہ بھی ہمارے لئے بہت اہم ہے۔ ابتدائے اسلام میں مسجد حکومت اور سوسائٹی کا مرکز ہوا کرتی تھی۔ یہیں حضور پاکؐ اور خلفائے راشدین بیٹھتے تھے، یہیں قاضی یعنی جج بیٹھ کر فیصلے کرتے تھے اور یہیں بیرونی سفراء سے ملاقات ہوتی تھی۔ آج ہم نے مساجد کو صرف نماز کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور نماز کے بعد ان کو بند کر دیتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ کمیونٹی کی ضروریات جیسے میٹنگ، کانفرنس، ریڈنگ روم وغیرہ کے لئے ان کو کھولا جائے تاکہ سوسائٹی کی بہت سی ضروریات بغیر فضول خرچی کے پوری ہو سکیں۔اسی طرح جمعہ کے پہلے خطبے کو مقامی زبان میں ہونا چاہئے تاکہ خطبے کا اصل مقصد عوام کو حاصل ہو سکے اور قوم کو ہر ہفتے اپنے مسائل اور ذمے داریوں کے بارے میں ہدایت مل سکے۔ خطبے کو عربی میں دینے پر اصرار کر کے ہم نے خطبے کے عظیم مقصد کو فوت کر دیا ہے۔ مساجد کو مسلکی نہیں ہونا چاہئے۔اللہ پاک نے قرآن پاک میں کہا ہے کہ ''المساجد للہ'' (مسجدیں اللہ کی ہیں)۔ پھر کیسے مساجد کچھ خاص فرقوں کی ہو گئیں؟ مساجد میں نہ صرف تمام مسلمانوں کا استقبال ہونا چاہئے بلکہ غیر مسلمین پر بھی پابندی نہیں ہونی چاہئے تاکہ وہ آکر اپنی آنکھ سے اسلامی عبادت کی سادگی اور روحانیت کا مشاہدہ کر سکیں۔آپ اپنے علاقوں میں ائمۂ کرام اور مساجد کے ذمے داروں پر ان باتوں کے بارے میں زور ڈالیں۔

آخر میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں کہ جس ملک میں آپ ہیں، اس کے قوانین وضوابط اور کلچر کا

احترام کریں۔ یہ ہر فرد کی ذمے داری ہے کیونکہ اگر ہمارا ایک فرد بھی غلطی کرتا ہے تو پورے گروپ کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ جس علاقے میں آپ ہیں وہاں حکومتیں تنقید برداشت نہیں کرتی ہیں۔آپ بھی اس کا خیال رکھیں اور اپنے کام سے کام رکھیں تاکہ اپنے لئے اور دوسرے ہندوستانیوں کے لئے مسئلہ کھڑا نہ کریں۔ (منامہ (بحرین) میں جامعہ ملیہ اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز کے منعقد کردہ پروگرام بتاریخ ۹؍ دسمبر ۲۰۲۲ میں کلیدی تقریر۔)

اخبار علمیہ

کرونا اور سودی قرضوں سے متعلق مسائل پر سیمینار اور منظور شدہ چند تجاویز

جدید پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے ۱۹۶۳ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں قائم کی تھی۔ اس مجلس نے رؤیت ہلال اور انشورنس جیسے بعض اہم موضوعات پر تجاویز منظور کی تھیں۔ اکتوبر ۲۰۱۹ء میں موجودہ ناظم ندوہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کے ایما پر اس مجلس کا احیا ہوا اور مجلس نے سردست کرونا اور سودی قرضوں سے متعلق ایک دو روزہ فقہی سیمینار بعنوان "کرونا سے متعلق مسائل/ سرکاری قرضوں کا شرعی حکم" کا فیصلہ کیا۔ ۲۴-۲۳ نومبر ۲۰۲۲ء کو یہ سیمینار منعقد ہوا۔ اس میں پورے ملک کے ۷۵ سے زاید علما شریک ہوئے۔ آخری نشست میں مذکورہ دونوں مسائل پر اتفاق رائے سے جو تجاویز انتہائی غور و خوض کے بعد منظور کی گئیں اس کے مطابق کرونا وبائی مرض ہے۔ اس کا مریض شرعی نقطۂ نظر سے ہر قسم کی ہمدردی و تعاون کا مستحق ہے۔ اس وبا سے تحفظ کے لیے ظاہری تدابیر اور طبّی ماہرین کی ہدایات پر عمل کے ساتھ ساتھ توبہ واستغفار اور صدقہ کا اہتمام ضروری ہے۔ ایسی وبائی صورت حال اور حکومتی ہدایات کے پیش نظر مساجد میں باجماعت نماز کے عدم ادائیگی، جمعہ اور عیدین کی نمازوں کا گھر ہی میں ادا کرنے ،ماسک لگا کر اور فاصلہ سے نماز ادا کرنے اور ڈاکٹر کے مشورہ پر کرونا متاثر کو روزہ نہ رکھنے کی گنجائش ہے۔ مسجدوں میں مکمل تالابندی، اس کو کووڈ سینٹر بنانا اور اذان وقت پر نہ دینا صحیح نہیں۔ کرونا متاثر کو مسجد میں آنا ممنوع ہے۔ لیکن اس کو الگ تھلگ کر دینا اسلامی تعلیمات اور انسانیت کے منافی ہے۔ کرونا متاثر کو غسل دینا یا تیمم کرانا یا مسنون کفن پہنانا دشوار ہو تو اس کو بغیر غسل اور کرونا کور پر دفنایا جاسکتا ہے۔ نماز جناہ اگر نہیں پڑھی گئی ہے تو لاش کے تغیر کے گمان غالب نہ ہونے تک اور قبر کی جگہ نہ معلوم ہونے پر اس کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی جاسکتی ہے۔ الکحل آمیز سینیٹائزر کا استعمال اور ویکسین لگانا مباح ہے۔

۱۹۷۱ء میں مجلس نے سرکاری قرضوں کے موضوع پر سوالنامہ ترتیب دیا تھا۔ اس وقت کے ممتاز علما کے جوابات بھی آئے تھے لیکن فیصلہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس سیمینار میں از سر نو اس پر بھی غور کیا گیا اور

مقالات لکھوائے گئے۔ ۱۹۷۱ء سے ۲۰۲۲ء تک سرکاری سودی قرضوں اور بینکوں کے سودی قرضوں کے بارے میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان پر بھی اس سیمینار میں غور وخوض کیا گیا۔ سرکاری وغیر سرکاری سودی قرضوں کے متعلق منظور شدہ تجاویز کے مطابق قرض دے کر زیادہ واپس لینا سود ہے اور یہ حرام ہے لیکن قرض خواہ اگر اپنی خوشی سے کچھ اضافہ کر کے قرض واپس کرے تو یہ پسندیدہ ہے۔ بلا ضرورت قرض لینا ناپسندیدہ ہے لیکن اگر قرض لینا ہی پڑ جائے تو لینے والے پر وقت مقررہ پر ادائیگی واجب ہے۔ استطاعت کے باوجود قرض نہ ادا کرنا جائز نہیں۔ مسلمانوں کو انفرادی یا اجتماعی طور پر ضرورت مندوں کو بآسانی غیر سودی قرض فراہمی کا نظم کرنا چاہئے۔ کسی بھی طرح غیر سودی قرض حاصل نہ ہونے کی صورت میں شدید ضرورت مثلاً قانونی مجبوری، زمین جائیداد، کاروبار کی حفاظت، حصول تعلیم اور علاج و معالجہ کے لیے بقدر ضرورت سودی قرض لینے کی گنجائش ہے۔ لیکن چھوٹے موٹے کاروبار یا دوسرے ذریعۂ معاش کے حصول یا شادی وغیرہ کے لیے بینک یا کسی سے سودی قرض یا لون لینے کے متعلق کسی منظور شدہ تجویز کا ذکر رپورٹ میں نہیں ہے۔

سال ۲۰۲۲ء کا لفظ ''گیس لائیٹنگ''

گیس لائیٹنگ gaslighting انگریزی زبان کا ایک نیا لفظ ہے جو نفسیاتی حربے استعمال کر کے کسی کو گمراہ کرنے اور اس کو اپنے آپ پر شک کرنے پر مجبور کرنے کے معنٰی میں بولا جاتا ہے۔ میریم ویبسٹر ڈکشنری کی ویب سائٹ پر یہ سال کا لفظ قرار دیا گیا ہے یعنی یہ لفظ سب سے زیادہ استعمال ہوا ہے۔ میریم ویبسٹر ڈاٹ کام پر ایک سال پہلے کے مقابلہ میں اس لفظ کی تلاش میں ۲۰۲۲ء میں ۱۷۴۰ فیصد کا اضافہ ریکارڈ کیا گیا۔ یہ ایسا لفظ ہے جو انگریزی زبان میں تیزی سے ابھرا ہے، خاص طور پر پچھلے چار برسوں میں۔ میریم ویبسٹر ڈکشنری کے ایڈیٹر سوکولوسکی نے کہا یہ میرے اور ہم میں سے بہت سارے لوگوں کے لیے حیران کن تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ یہ ایک ایسا لفظ تھا جو سال کے ہر ایک دن کثرت سے دیکھا جاتا تھا۔ گیس لائیٹنگ کے لیے میریم ویبسٹر کی سب سے موزوں اور بہتر تعریف کسی شخص کی نفسیاتی ہیرا پھیری ہے جو متاثر کے اپنے خیالات، حقیقت کے ادراک یا یادداشت کی صداقت پر سؤال اٹھانے کا سبب بنتی ہے اور اس سے کنفیوژن، خود اعتمادی کی کمی یا ذہنی عدم استحکام کی غیر یقینی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ گیس لائیٹنگ ایک گھناؤنا ہتھیار ہے جسے بد سلوکی کرنے والے، سیاست داں اور خبر ساز لوگ استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک کارپوریٹ حربہ یا عوام کو گمراہ کرنے کا طریقہ ہے۔ یہاں

میڈیکل گیس لائیٹنگ بھی ہوتی ہے جب صحت کی دیکھ بھال کرنے والا پیشہ ور، مریض کی علامت یا بیماری کو ''آپ کے سر کے ساتھ'' کہہ کر مسترد کرتا ہے۔ یہ لفظ پہلی بار ۸۰ سال پہلے ۱۹۳۸ء میں پیٹرک ہیملٹن کے ڈرامہ Gas Light (گیس لائٹ) میں استعمال کیا گیا تھا۔اس اصطلاح کو بعد میں ماہرین صحتِ دماغ نے بد سلوکی والے تعلقات میں جبری کنٹرول کے لیے استعمال کیا۔میریم ویبسٹر ڈکشنری، جو اپنی سائٹ پر ایک ماہ میں سو ملین پیج ویوز کو لاگ ان کرتی ہے، صرف ڈیٹا کی بنیاد پر اپنے سال کے لفظ کا انتخاب کرتی ہے۔سوکولوسکی اوران کی ٹیم نے سدابہار الفاظ کو عام طور پر اس بات کا اندازہ کرنے کے لیے تلاش کیا کہ کون سالفظ ایک سال پہلے کے مقابلہ میں کم یازیادہ استعمال ہوا۔وہ اس بات کا تجزیہ نہیں کرتے کہ لوگوں نے الفاظ کو کیوں تلاش کیا؟اس لفظ نے ۲۰۲۲ء کا پورا سال ٹاپ ۵۰ الفاظ میں گذارا اور تب ہی میریم ویبسٹر میں سال کے بہترین لفظ کا درجہ پاسکا۔اس کے علاوہ رپورٹ میں سال کے مزید ٹاپ ٹن (زیادہ استعمال ہونے والے دس) الفاظ بھی دیے گئے ہیں جو اس طرح ہیں۔

Oligarch(روسی لفظ ''اولیگارک'' جو یوکرین پر روسی حملے بعد زیادہ عام ہوا) کے معنی اعلی خاندان کا فرد اوراعلی سرکاری عہدے دار ہے۔

Omicron (کووڈ ۱۹ کی مختلف شکل اور یونانی حروف ہجا کا پندرہواں الفابٹ (حرف)۔

Codify(اسقاط حمل کے حقوق کو قانونی شکل دینا)۔

Queen Consort(رفیق ملکہ)۔ برطانیہ کے بادشاہ چارلز کی بیوی کیمیلا کو اس نئے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ چارلز سے شادی کے وقت وہ پہلے سے طلاق یافتہ تھیں اس لئے ان کو مکمل ''ملکہ'' کا درجہ نہیں ملا۔

Raid(پولیس یا ایجنسیوں کے ذریعے گھر یا آفس کی تلاشی)۔یہ سابق صدر امریکہ ٹرمپ کے Mar-a-Lago گھر کی تلاش کے بعد عام ہوا۔

Sentient(گوگل کی طرف سے اس انجینئر کی تلاش جس نے دعویٰ کیا تھا کہ ایک غیر ریلیز شدہ اے آئی سسٹم حساس ہو گیا ہے)۔

Cancel culture(ناپسندیدگی کے اظہار کے طریقے کے طور پر بڑے پیمانے پر منسوخی میں مشغول ہونے کی مشق یا رجحان)۔

Loamy(اس کو بہت سے Wordle صارفین نے اگست میں آزمایا حالانکہ اس دن صحیح لفظ جو کر تھا)۔

LGBTQIA(اس لفظ کو ہم جنس پرستی، غیر جنسی یا سوال کرنے وغیرہ کے معنی میں تلاش کیا گیا)۔

(ٹائمز آف انڈیا، وارانسی، ۳۰ نومبر ۲۲ء ص ۱۲) **ک۔ ص۔ اصلاحی**

وفیات

ڈاکٹر یوسف القرضاوی (۱۹۲۶-۲۰۲۲)

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

zik@zik.in

ڈاکٹر یوسف القرضاوی (پورا نام: یوسف عبداللہ القرضاوی) شمالی مصر کے ضلع المحلۃ الکبری کے گاؤں صفط تراب میں ۹، ستمبر ۱۹۲۶ کو پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال الدوحۃ (قطر) میں ۲۶، ستمبر ۲۰۲۲ کو ۹۶، سال کی عمر میں ہوا۔ اگلے دن ان کی تدفین ہزاروں عقید تمندوں کی موجودگی میں عمل میں آئی۔ مسجد اقصی میں لاکھوں لوگوں نے ان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ وہ ممتاز عالم دین، فقیہ، شاعر اور خطیب تھے۔

القرضاوی نے ۱۹۴۴ سے ۱۹۵۸ تک جامعۃ الازہر میں ابتدائی سے لے کر ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۷۳ میں زکوۃ کے بارے میں تھیسس لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ان کو دنیا بھر کے بہت سے اعزاز ملے جس میں فیصل انعام برائے اسلامی ریسرچ (۱۹۹۴) شامل ہے۔ انھوں نے الاتحادالعالمی لعلماء المسلمین نام کی مسلم علماء اور دانشوروں کی عالمی تنظیم قائم کی اور اس کے عرصہ تک صدر رہے۔

القرضاوی الاخوان المسلمون کے ابتدائی دور میں ہی ممبر بن گئے تھے اور اس پاداش میں وہ پہلی دفعہ سنہ ۱۹۴۹ میں جیل گئے۔ جمال عبدالناصر کے زمانے میں اسی جرم میں وہ تین بار گرفتار ہوئے (جنوری اور پھر نومبر ۱۹۵۴، اور ۱۹۶۳)۔ وہ الاخوان المسلمون کے صف اول کے قائد تھے اور اس کے نظریہ ساز سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے الإخوان المسلمون: سبعون عاما فی الدعوة والتربية والجهاد نامی کتاب تحریر کی۔ وہ الاخوان المسلمون کو معتدل اسلام کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ وہ آخر تک الاخوان المسلمون سے وابستہ رہے۔ اپنی پوری زندگی میں وہ صرف اسی ایک جماعت سے جڑے، زندگی بھر اس کا ساتھ نبھایا اور کبھی بھی اس کی بنیادی پالیسیوں سے انحراف نہیں کیا۔ وہ ان ازہری علماء میں سے ہیں جو شروع سے الاخوان المسلمون سے جڑے اور اس کی قیادت میں نمایاں کردار ادا کیا جیسے محمد الغزالی، سید سابق، احمد الشرباصی، احمد حسن الباقوری وغیرہ۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں جب الاخوان المسلمون کی صفوف میں انشقاق ہوا تو القرضاوی حسن البنا کے ماننے

والے گروپ کے ساتھ تھے۔ پھر جب چھٹے دہے میں سید قطب الاخوان کے ایک اہم لیڈر کے طور سے ابھرے اور الاخوان کی اعتدالی فکر سے ہٹ کر انھوں نے شدت پسندی پر اپنی سوچ کی بنیاد رکھی اور ان کے گرد ایک گروپ جمع ہو گیا تو بھی القرضاوی حسن البنا کے ماننے والے گروپ کے ساتھ ہی رہے۔

القرضاوی نے دوبار الاخوان المسلمون کا صدر (مرشد) بننے سے انکار کیا۔ پہلی بار ۱۹۷۶ میں الاخوان کے دوسرے مرشد جسٹس حسن الھضیبی کے انتقال کے بعد انہوں نے یہ منصب قبول کرنے سے انکار کیا۔ دوسری بار، پانچویں مرشد مصطفی مشہور کی وفات کے بعد منتخب ہونے والے مرشد المأمون الھضیبی کی درخواست کو انھوں نے رد کر دیا کہ الھضیبی ان کے لئے مرشد کا منصب چھوڑ دیں اور وہ (القرضاوی) مرشد بن جائیں۔ دونوں بار ان کا خیال تھا کہ لکھنا پڑھنا، وعظ وارشاد ہی ان کا کام ہے جو تنظیمی ذمے داری لینے سے متاثر ہو گا۔ اور اسی وجہ سے القرضاوی تمام ملکی و غیر ملکی اسلامی تحریکوں اور تنظیموں میں مقبول تھے، حتیٰ وہ سلفیوں کے درمیان بھی پسندیدہ تھے حالانکہ ان کے تعلقات الاخوان المسلمون سے کبھی اچھے نہیں رہے۔

القرضاوی عصر حاضر کے ان قلیل علماء میں سے ہیں جنہوں نے خالص مذہبی حدود سے نکل کر سماجی، سیاسی اور اجتماعی حدود میں کام کیا۔ ان کا ایک خاص کام فقہ کو آسان بنانا (تیسیر) ہے جو الاخوان المسلمون کے مقاصد میں شامل تھا اور جس کی عمدہ مثال سید سابق کی فقه السنّة ہے۔ القرضاوی نے اسی نہج پر الحلال والحرام فی الاسلام نامی کتاب ۱۹۵۹ میں لکھی جس کا تقریباً ۲۰ زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب دنیا بھر میں ان کی پہچان بن گئی۔ اس کتاب میں انھوں نے لوگوں کی زندگی آسان بنانے کا راستہ اپنایا ہے اور غیر مذہبی تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اسلام کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا ہے۔

ان کی تحریروں میں قدیم (تراثی) زبان کے بجائے جدید زبان اور معاصر انداز ہوتا ہے تاکہ عام آدمی بھی دین کے مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ الحلال والحرام کے بعد انھوں نے اسی نہج پر دو جلدوں میں فقه الزكاة، الاسلام والفن اور تین جلدوں میں فتاوی معاصرة جیسی کتابیں شائع کیں۔ موسوعیت، توازن اور روشن خیالی ان کی پہچان ہیں۔

القرضاوی نے ایسے مسائل پر بھی لکھا جن سے علماء بالعموم اجتناب کرتے ہیں، جیسے موسیقی، گانا، انٹرٹینمنٹ (اللهو والترويح)۔ حرام قرار دینے اور بالکل منع کرنے کے بجائے انھوں نے ان مسائل پر اعتدال کا راستہ اپنایا ہے۔ اسی طرح انھوں نے عورتوں کے اجتماعی اور سیاسی حقوق کے بارے میں لکھا اور اس تشدد اور تحریم کی مخالفت کی جو بالعموم عورتوں کے سلسلے میں علماء کے یہاں رائج ہے۔ انھوں نے

عورتوں کے مکمل سیاسی حقوق کی وکالت کی اور سیاست میں عورت کے کام کو جائز قرار دیا۔اس سلسلے میں ان کی کتاب مرکزالمرأة فی الحیاة السیاسیة دیکھی جاسکتی ہے۔اسی طرح انھوں نے متعدد سیاسی پارٹیوں کے قیام کو جائز قرار دیا۔

القرضاوی بہت بلیغ خطیب تھے۔ان کے خطبوں اور تحریروں سے لاکھوں لوگ متاثر ہوتے تھے اور ان کو سننے کے لئے بیتاب رہتے تھے۔ان کے ہزاروں خطبے اور تقریریں انٹرنٹ پر موجود ہیں جو انھوں نے اپنی تقریباًساٹھ سال کی عملی زندگی میں دیے، خصوصاریڈیو کا پروگرام ”نور و ہدایۃ“ اور ٹیلی ویژن کا پروگرام ”الشریعۃ والحیاۃ“ اور ”ھدی الاسلام“۔ اسی ملکۂ خطابت کی وجہ سے الاخوان المسلمون نے ان کو اپنی ترویج کے لئے بیرونی ممالک بھیجا۔کہا جاتا ہے کہ ان کے ہفت روزہ ”الشریعۃ والحیاۃ “پروگرام کو،جو الجزیرہ ٹیلی ویژن پر نشر ہوتا تھا،چالیس ملین لوگ بیک وقت دیکھتے تھے۔

سنہ ۱۹۵۴ میں جب الاخوان المسلمون کا پہلی بار جمال عبدالناصر کی حکومت سے ٹکراؤ ہوا تو القرضاوی بھی جیل جانے والوں میں شامل تھے۔اس کے بعد جب حالات مزید سخت ہوئے تو بہت سے اخوانیوں نے مصر سے ہجرت کی اور بالخصوص سعودی عرب، خلیج یا مغربی ممالک کا رخ کیا۔ان میں القرضاوی بھی شامل تھے۔سنہ ۱۹۶۱ میں القرضاوی خلیج گئے۔شروع میں وہ کویت میں رہے، پھر قطر منتقل ہوگئے جہاں وہ زندگی کے آخری لمحات تک رہے بلکہ وہیں کی شہریت بھی اختیار کرلی۔ وہ قطر کے ایک مذہبی مدرسے کے شروع میں پرنسپل رہے اور ۱۹۷۷ میں انھوں نے قطر یونیورسٹی میں کلیۃالشریعۃ کی بنیاد رکھی اور اس کے استاد اور ڈین مقرر ہوئے۔تدریسی ذمے داری کا یہ سلسلہ ۱۹۹۰ تک چلا۔اسی کے ساتھ وہ قطر یونیورسٹی کے مرکز برائے تحقیقات سنت وسیرت کے بھی ڈائریکٹر مقرر کئے گئے۔اپنی خطابت،موسوعی علم اور فی البدیہہ تقریر کے ملکہ کی وجہ سے وہ بہت جلد معروف و مقبول ہوگئے۔اس عرصے میں وہ اپنی دینی ذمہ داریوں سے الگ نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے تحریر و تقریر سے اپنا علمی اور تبلیغی ودعوتی کام جاری رکھا۔اس دوران وہ سالہاسال قطر کی راجدھانی الدوحۃ کی مسجد عمر بن الخطاب میں خطبۂ جمعہ دیتے الا آنکہ وہ بیماری یا سفر کی وجہ سے معذور ہوں۔

عالم اسلام اور یورپ و امریکہ کے اسفار میں بھی القرضاوی پوری طرح سے مبلغ اسلام کا کردار نبھاتے رہے۔وہ ہر علاقے میں وہاں کی اسلامی تنظیموں اور عوام سے رابطہ قائم کرتے اور ان کے جلسوں میں جاتے۔انھوں نے الاخوان المسلمون کے کارکنوں کی کردار سازی میں بھی حصہ لیا۔الاخوان کے آرگن ” الدعوۃ “میں ان کے ایسے مضامین بعد میں ثقافۃ الداعیۃ کے نام سے کتابی شکل میں شائع

ہوئے۔اسی طرح انھوں نے الوقت فی حیاۃ المسلم (مسلمان کی زندگی میں وقت کی اہمیت) اور ظاھرۃ الغلو فی التکفیر (تکفیر میں غلو کا ظاہرہ) لکھی تاکہ تکفیر کی وہ موج کا، جو پچھلے چند دہوں سے مسلمانوں میں پھیل رہی ہے، مقابلہ کیا جاسکے۔اسی طرح انھوں نے اسلامی تحریک میں درآنے والے عیوب کے بارے میں کھل کر لکھا اور ان کی نشاندہی کی۔اس سلسلے میں ان کی اہم کتابیں الصحوۃ الاسلامیۃ بین الجحود والتطرف، الصحوۃ الإسلامیة وهموم الوطن العربي والإسلام، الصحوۃ الإسلامیة بین الاختلاف المشروع والتفرق المذموم، الصحوۃ الإسلامیة من المراهقة إلى الرشد، من أجل صحوة راشدة تجدد الدین وتنهض بالدنیا اور أولویات الحرکة الإسلامیة فی المرحلة القادمة شامل ہیں۔

فلسطین کے مسئلے پر وہ ہمیشہ بولتے اور لکھتے رہے اور جہاں بھی جاتے فلسطین کے مسئلے کو اٹھاتے۔ ان کے نزدیک دریائے اردن سے لے کر بحر ابیض تک سارا علاقہ ''فلسطین'' ہے۔اور مسئلۂ فلسطین کا حل صرف یہ ہے کہ وہاں اسلامی حکومت قائم ہو جس کی راجدھانی بیت المقدس ہو۔ فلسطین کے بارے میں ان کی بہت سی نظمیں بھی ہیں۔ان کی ایک نظم کا یہ مصرع بہت مشہور ہے:

فلسطین بلاقدس کجثمان بلارأس

(بیت المقدس کے بغیر فلسطین، سر کے بغیر دھڑ ہے)

فلسطین کے بارے میں انھوں نے اپنے ایک مشہور فتوی میں کہا تھا کہ فلسطین کی پوری زمین اسلامی وقف ہے جس میں تصرف کرنا حرام ہے۔یہ فتوی اس وقت آیا جب کچھ عرب طاقتیں اسرائیل کے ساتھ مسئلۂ فلسطین کو حل کرنے کے لئے گفتگو کر رہی تھیں۔انھوں نے خودکش حملوں کی تایید کی اور ان کو ''استشہادی حملے'' قرار دیا جو ان کے نزدیک جہاد کی ایک شکل ہے۔اس فتوے کی وجہ سے امریکی حکومت نے ان کا امریکا میں داخلہ بند کر دیا۔

امت مسلمہ کے ہر مسئلے کے بارے میں القرضاوی ایک واضح رائے رکھتے تھے۔انھوں نے افغانستان میں روسی قبضے کے خلاف جہاد کی کھل کر تایید کی جو افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء تک جاری رہی۔ایسے ہی انھوں نے عراق پر امریکی حملے کی کھل کر مذمت کی اور عراق میں امریکی فوجوں کے خلاف جہاد کے واجب ہونے کا فتوی دیا۔انھوں نے صاف طور سے کہا کہ عراق میں امریکی فوجیں قابض اور غاصب ہیں اور اس کی مزاحمت کرنے والوں کی مدد کرنا واجب ہے۔اس فتوی کی وجہ سے بھی ان پر دہشت گردی کی تایید کا الزام لگا۔اسی طرح ڈنمارک میں حضور اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کارٹونوں کی اشاعت کی انھوں نے مذمت کی اور نصرت رسولؐ کے لئے کانفرنس کے انعقاد

کی دعوت دی جو مارچ ۲۰۰۶ میں منامہ (بحرین) میں منعقد ہوئی۔ مزید برآں ڈنمارک کی مصنوعات کے بائیکاٹ کی بھی انھوں نے تایید کی۔ اسی طرح جب کیتھولک چرچ کے پوپ بینڈکٹ نے اسلام کے خلاف رائے زنی کی کہ وہ ''شر اور غیر انسانی'' (evil and inhuman) ہے تو القرضاوی نے کھل کر اس کی مذمت کی۔ انھوں نے ''ادفع دولارا تنقذ مسلما'' (ایک ڈالر دو، ایک مسلمان بچاؤ) کا نعرہ دیا جس کی وجہ سے کویت کی خیراتی تنظیم الھیئة الخیریة الإسلامیة العالمیة قائم ہوئی۔ اسی طرح فلسطین میں خیراتی کام کرنے کے لئے انھوں ائتلاف الخیر نامی تنظیم قائم کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ان کے نزدیک اگر فتنہ کا ڈر نہ ہو تو مرد کا عورت سے مصافحہ کرنا جائز ہے۔ اسی طرح انھوں نے عورتوں کے ختنہ کو غلط قرار دیا اور اس کو بند کرنے کا مطالبہ کیا۔ عورتوں کا ختنہ مصر اور بعض افریقی ممالک میں عام ہے۔

ایران کے بعض مسلم اور افریقی ممالک میں سنیوں کے درمیان تشیع پھیلانے کی بھی القرضاوی نے مخالفت کی۔ انھوں نے شام میں ایران اور حزب اللہ کے دخل اندازی کی شدید الفاظ میں مخالفت کی جس کی وجہ سے ایران اور شیعہ ان کے خلاف ہو گئے۔ جون ۲۰۱۷ میں مصر، متحدہ عرب امارات، سعودی عرب اور بحرین نے ان کو ''دہشت گرد'' قرار دیا۔ اس وقت ان ملکوں نے ۱۱ ا اشخاص اور دو تنظیموں کو دہشت گرد یا دہشت گردی کا مؤید گردانا تھا۔ ان میں یوسف القرضاوی اور ان کی تنظیم الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین کا نام شامل تھا۔ اس وقت ان ملکوں کی قطر سے ٹھنی ہوئی تھی اور قطر کی حکومت کو بھی یہ حکومتیں دہشت گردوں کی معاون کہتی تھیں۔ برطانیا اور فرانس نے ان کو ''متشدد'' ہونے کے الزام میں اپنے ملکوں کا ویزا دینا منع کر دیا۔

صدر مرسی کے خلاف فوجی انقلاب کے بعد مصر کی فوجی حکومت نے یوسف القرضاوی پر مختلف الزامات لگائے اور ان کی دنیا کے کسی خطے میں گرفتاری کے لئے انٹرپول سے درخواست کی لیکن انٹرپول نے ۲۰۱۸ میں مصری درخواست کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ یہ سیاست زدہ ہے اور اس میں شفافیت اور غیر جانبداری کی کمی ہے۔ مصر نے ان کا ملک میں داخلہ ممنوع کر دیا۔ اسرائیل اور اس کے ہمنوا تھنک ٹینکوں نے کافی عرصہ پہلے سے القرضاوی کے خلاف ماحول بنانا شروع کر دیا تھا۔

القرضاوی شاعر بھی تھے اور انھوں نے ڈراما بھی لکھا۔ ان کے دو مطبوعہ دیوان ہیں: نفحات ولفحات اور المسلمون قادمون۔ بوسنہ اور ہرزگ میں جب مسلمانوں نے مسلم کشی کے خلاف پرچم جہاد بلند کیا تو انھوں نے بڑی پر اثر نظم لکھی جو اس وقت کافی پڑھی جاتی تھی۔ اس کا ایک مقطع یہ ہے:

أنا عائد أقسمت أنی عائد والحق یشھد ونعم الشاھد

(میں واپس آنے والا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں واپس آنے والا ہوں۔ حق شاہد ہے اور حق ہی بہتر شاہد ہے)۔

جمال عبدالناصر کے عہد میں جب اسلامی اور اشتراکی افکار کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی تو القرضاوی نے تحریک اسلامی کی حمایت و تایید میں متعدد کتابیں لکھیں مثلاً الحل الإسلامي فريضة وضرورة ، الحلول المستوردة وماذا جنت على أمتنا، بينات الحل الإسلامي اور أعداء الحل الإسلامي۔

بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں، جب اسلامی بیداری کا دور شروع ہوا، تو القرضاوی نے اس تحریک کو صحیح راستے پر رکھنے اور اسے فکری غذا فراہم کرنے کے لئے متعدد کتابیں لکھیں مثلاً ظاهرة الغلو فى التكفير، أين الخلل، فقه الأولويات، الصحوة الإسلامية بين الجحود والتطرف، الصحوة الإسلامية وهموم الوطن العربي والإسلامي،الصحوة الإسلامية بين الاختلاف المشروع والتفرق المذموم، الصحوة الإسلامية من المراهقة إلى الرشد، من أجل صحوة راشدة تجدد الدين وتنهض بالدنيا اور أولويات الحركة الإسلامية فى المرحلة القادمة۔

پھر جب اسلامی بیداری کے نام پر بہت سی تنظیمیں ابھر کر سامنے آئیں اور ایک دوسرے سے تنافس کرنے لگیں بلکہ لڑائی بھی، تو القرضاوی نے متعدد کتابیں لکھیں تاکہ اسلام کے نام پر کام کرنے والی مختلف جماعتوں کے درمیان تعاون ہو۔ اس مرحلے کے لئے ان کی کتابوں میں یہ شامل ہیں: شمول الإسلام، المرجعيةالعليا فى الإسلام للقرآن والسنة، موقف الإسلام من الإلهام والكشف والرؤى ومن التمائم والكهانة والرقى، السياسة الشرعية فى ضوء نصوص الشريعة ومقاصدها اور كيف نتعامل مع التراث والاختلاف والتمذهب۔

اگلے مرحلے میں جب اسلامی حکومت کی بات ہونے لگی بلکہ بعض جگہوں پر تحریک اسلامی نے حکومت بھی سنبھالی یا اس میں شریک ہوئی تو القرضاوی نے متعدد کتابیں لکھیں تاکہ اسلامی حکومت کی شکل واضح کر سکیں۔ ان کتابوں میں ملامح المجتمع الاسلامى الذى ننشده، شريعة الإسلام صالحة للتطبيق فى كل مكان وزمان، غير المسلمين فى المجتمع الإسلامي، الأقليات الدينية والحل الإسلامي اور الردة وعقوبة المرتد فى ضوء القرآن والسنة۔

اور جب عالمگیریت (گلوبلائیزیشن) کا زمانہ آیا تو بھی القرضاوی نے نئی صورتحال سے نپٹنے کے لئے متعدد کتابیں لکھیں مثلاً: المسلمون والعولمة ، خطابنا الديني فى عصر العولمة، الإسلام والمسلمون وعلوم المستقبل على أعتاب القرن القادم، المسلمون والتخلف العلمي، رعاية البيئة فى شريعة الإسلام، حقوق المسنين من منظور إسلامي، فقه الجهاد، الاسلام فى عصر العولمة، الإخوان

المسلمون: سبعون عاما فی الدعوة والتربية اور الغرب والإسلام۔ القرضاوی نے تقریبا ۱۷۰ کتابیں تالیف کیں۔ القرضاوی نے اپنی خودنوشت (مذکّرات الشیخ القرضاوی) بھی لکھی۔ اسی کے ساتھ ان کی ہزاروں تقریریں اور انٹرویو ریکارڈ کئے گئے۔ ان کی تحریریں ان کی اپنی ویب سائٹ qardawi.net پر موجود ہیں۔

القرضاوی نے تألیف وتصنیف، وعظ وارشاد، تعلیم کے ساتھ بہت سی تنظیموں کو قائم کیا یا ان میں مؤثر شرکت کی۔ ان تنظیموں میں یہ شامل ہیں:

- مرکز بحوث إسهامات المسلمین فی الحضارة (قطر)
- مجمع الفقه الإسلامي (اسلامی کانفرنس، جده)
- مجمع الفقه الإسلامي (جده، رابطۂ عالم اسلامی)
- المجمع الملکي لبحوث الحضارة الإسلامية (أردن)
- بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی (اسلام آباد)
- مرکز الدراسات الإسلامية (آکسفورڈ)
- رابطۂ عالم اسلامی
- جمعية الاقتصاد الإسلامي (قاہرہ)
- الهيئة الخيرية الإسلامية العالمية (کویت)
- منظمة الدعوة الإسلامية فی افریقیا (خرطوم)
- الهيئة الشرعية العالمية للزكاة (کویت)
- صندوق قطر الإسلامي للزكاة والصدقات
- المجلس الأوربي للإفتاء والبحوث
- ائتلاف الخير
- جمعية البلاغ الثقافية لخدمة الإسلام (جس نے اسلام اونلائن شروع کیا لیکن آپسی اختلافات کی وجہ سے چند سالوں میں یہ بہت بڑا کام بند ہو گیا)۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ الاتحاد العالمي لعلماء المسلمین (قطر) کا قیام ہے۔ دنیا میں اسلامی علماء اور اسکالرز کی یہ تنظیم ۲۰۰۴ میں قائم ہوئی اور ۲۰۱۷ تک علامہ القرضاوی اس کے صدر رہے۔ راقم الحروف اس تنظیم کا ۲۰۱۰ سے ممبر ہے اور اس دوران دو (۲) میقات کے لئے اس کا ٹرسٹی بھی رہ چکا

ہے۔آج یہ تنظیم دنیامیں اسلام اور مسلمانوں کی سب سے اہم تنظیم ہے۔

میری پہلی ملاقات شیخ یوسف القرضاوی سے بیروت میں ہمارے مشترکہ دوست حسین عاشور کے گھر پر دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔اس وقت وہ کویت کی اسلامی فقہی انسائیکلوپیڈیا میں کام کررہے تھے اور مشہور نہیں ہوئے تھے۔اس کے بعد کبھی کبھار ہلکی پھلکی ملاقاتیں رہیں۔ایک موقعے پر اکتوبر ۱۹۹۶ میں ان کی ہندوستان آمد کے دوران ان کا مرکز جماعت اسلامی ہند میں خطاب تھا جس کا فی البدیہہ ترجمہ، میں نے کیا۔اس وقت میں فی البدیہہ ترجمہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن شیخ نے اصرار کیا کہ جب میں بولوں تو تم لکھتے جاؤ اور جب میں رکوں تو اس کو پڑھ دو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور خوش قسمتی سے وہ اہم تقریر محفوظ ہوگئی۔ سنہ ۲۰۱۰ء کے بعد کئی سال تک ان سے میری ملاقات قطر میں الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین کے مجلس الأمناء (بورڈ آف ٹرسٹیز) کے اجتماعات میں ہوتی رہی جس کی وہ صدارت کرتے تھے۔میں نے ہمیشہ دیکھا کہ وہ بلاوجہ مداخلت نہیں کرتے تھے بلکہ خاموشی سے سنتے تھے اور آخر میں اپنی بات رکھتے تھے اور جو عمومی رائے بنتی تھی اس کو قبول کرتے تھے۔ان دنوں وہ اکثر اجلاس میں شریک ممبران کو اپنے گھر کھانے پر بلاتے جہاں وہ پوری بے تکلفی سے ہم لوگوں سے ملتے اور بات کرتے۔

اللہ پاک شیخ القرضاوی کی مغفرت فرمائیں اور ان کو جنت میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائیں۔انھوں نے اپنی پوری زندگی اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لئے لگادی۔ نتیجۃً دنیا کے مسلمانوں نے بھی ان کو دل سے چاہا اور عزت دی جو غالباً شاید ہی عصر حاضر میں کسی مسلم عالم دین کو ملی ہو۔ عصر حاضر میں امام خمینی کے بعد وہ واحد مسلم عالم دین تھے جن کی باتیں میڈیا بشمول مغربی میڈیا غور سے سنتا اور رپورٹ کرتا تھا۔

پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی مرحوم

یہ خبر بہتوں کو افسردہ کرگئی کہ پروفیسر خورشید نعمانی نے بھی اس جہانِ فانی کو الوداع کہہ دیا، ان کی وفات کی خبر بس ان کے چند قریبی اعزہ واحباب سے ملی، اخباروں کو خبر ہی نہیں کہ اردو زبان کا کیسا شریف قلم رخصت ہوگیا۔

خورشید نعمانی اصلاً خورشید مظہر الحق تھے، ردولی کے جناب انوار الحق نعمانی کے بیٹے اور دارالمصنفین کے ناظم شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے عزیز قریب اور اس خاندان کے چشم وچراغ جو اودھ ہی نہیں

پورے ہندوستان میں رشد وہدایت اور اصلاح خلق کے لیے مشہور و ممتاز تھا اور ہے، تصوف کی تمام جائز وپاکیزہ روایات کو عملاً معاشرہ میں قائم ورائج کرنے میں شیخ العالم شیخ احمد عبدالحق نے عہد خلجی سے جس سلسلہ کی آبیاری کی، یہ خانوادہ اس کے اثر سے آج بھی تروتازہ ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی اس کی ایک دلکش مثال تھے اور ان کی توجہ، تربیت سے ہمارے خورشید صاحب کی زندگی بھی تابندہ تر ہوگئی، شاہ صاحب نے خورشید نعمانی کی تعلیم کے لیے شبلی کالج اور تربیت کے لیے شبلی منزل کا انتخاب کیا، تعلیم کے دس سال اعظم گڑھ میں گزرے اور گویا یہ عشرہ کاملہ کے شاہد بن گئے۔ بعد کے اعلیٰ تعلیمی سفر میں ان کی منزل وہی ٹھہری جس کو شہر شبلی کہہ سکتے ہیں، بمبئی میں ایم-اے کیا اور پھر ڈاکٹریٹ بھی، پی ایچ ڈی کا مقالہ کسی بھی عنوان سے ہوسکتا تھا لیکن خورشید نعمانی کے ذہن و قلب نے شبلی اور دارالمصنفین ہی کو اپنی تحقیق کا مرکز بنانا پسند کیا، انہوں نے بہت پہلے اپنے ادبی عقیدہ کا اظہار کردیا تھا کہ شبلی سرسید کے قبیلے کی سب سے فعال شخصیت تھے۔ آل احمد سرور کی یہ بات ان کی رگ وپے میں سرایت کرگئی کہ شبلی سرسید کے ساتھ رہ کر بھی ان سے بہت آگے دیکھ رہے تھے، خورشید صاحب نے دارالمصنّفین کی ادبی خدمات کو اپنی پی ایچ ڈی کا عنوان بنایا، دارالمصنفین کی خدمات کے اعتراف کی یہ غالباً پہلی کاوش تھی اور کیسی پر خلوص کاوش تھی کہ اس کے بعد یونیورسٹیوں میں اسی موضوع پر مقالات کا سلسلہ جاری ہوگیا، پھر ڈی لٹ کے لیے انہوں نے دارالمصنفین کی علمی خدمات کا موضوع لیا، بعد میں کتابی شکل میں دارالمصنفین کے سلسلہ مطبوعات میں اس کو شامل کرلیا گیا۔

انہوں نے زندگی کی متاع کا بیشتر حصہ بمبئی کی نذر کردیا لیکن وہ ہمیشہ کہتے رہے کہ اعظم گڑھ کے علمی وادبی ماحول نے قلب ودماغ کو جلا بخشی، فکر و نظر کو وسعت دی اور علم وادب کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا، وہ یہاں اس وقت تھے جب دارالمصنفین کے آسمان پر ایک نہیں کئی سورج ضیا بخشی میں پیش پیش تھے، نعمانی صاحب کی ساری زندگی اسی حرارت سے قوت پاتی رہی، جب تک یہ قوت رہی وہ سیمیناروں میں انہی یادوں کی متاع لٹاتے رہے، قویٰ مضمحل ہونے لگے تو وہ پھر بزرگوں کی اسی بستی میں واپس آگئے جہاں کی خاک سے اٹھے تھے، امراض کا غلبہ ہوا تو موت نے اس سے چھٹکارا دلادیا۔ ولیوں کی آرام گاہ میں ایک اور ولی پر رحمت حق کی چادر سایہ فگن ہوگئی۔ اللہم اغفرلہ وارحمہ۔ (ع۔ص)

تبصرۂ کتب

وضع المخطوطات العربیہ فی المکتبات الہندیۃ: مکتبۃ اکادیمیۃ شبلی النعمانی نموذجا از ڈاکٹر صاحب عالم اعظمی ندوی۔ کاغذ وطباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۱۱۸، ملنے کا پتہ: علم لاحیاء التراث والخدمات الرقمیہ، قاہرہ۔ قیمت درج نہیں۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل نمبر: ۲۰۱۱۲۶۰۰۷۷۰۰+ ای میل: info@ilmarabia.co.uk

صاحب عالم ندوی کا تعلق اعظم گڑھ سے ہے۔ انھوں نے ندوۃ العلما، لکھنؤ اور قاہرہ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ اس وقت وہ مرکز حسن بن محمد للدراسات التاریخیۃ ،الدوحۃ۔قطر سے وابستہ ہیں۔

زیر نظر کتاب میں انہوں نے ہندوستانی کتب خانوں میں عربی مخطوطات کی حالت کا مختصراً اور شبلی اکیڈمی کے بعض عربی مخطوطات کا قدرے مفصل تعارف کرایا ہے۔ پوری کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کر کے معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلا باب ہندوستان میں عربی مخطوطات کی تاریخ سے متعلق ہے۔ دوسرا باب پبلک (سرکاری) اور نجی لائبریریوں کے تعارف اور ان میں موجود عربی مخطوطات سے متعلق ہے۔ اس میں علی گڑھ، رامپور، لکھنؤ، پٹنہ، مشرقی بنگال، راجستھان، حیدرآباد کے کتب خانوں کا مختصراً تعارف اور ان میں اسلامی علوم وفنون پر موجود بعض اہم عربی مخطوطات کا مجملاً تذکرہ ہے۔ تیسرا باب کتب خانہ دارالمصنفین کا تعارف اور چوتھا اس لائبریری میں محفوظ عربی کے اہم مخطوطات کا تعارف کے عنوان سے ہے۔ تعارف میں ایک خاکہ بنا کر صرف چند مخطوطات کا اندراج نمبر، کاتب کا نام، تاریخ کتابت، اوراق اور سطر کی تعداد وغیرہ اور بعض کی موجودہ حالت کے متعلق ہلکی پھلکی معلومات درج کی گئی ہیں اور لکھا ہے کہ ان کا میں نے از خود جائزہ لیا ہے اور اس پر نوٹ تیار کیا ہے۔ نظام الغرائب کے باب میں یہ لکھا ہے اس مخطوطہ کے مؤلف کے متعلق حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ج۲ ص۱۹۵۹ دیکھیں (ص ۴۳)۔ کتاب الجمل کے متعلق یہ لکھا ہے کہ اس کا شمار ادارہ کے سب سے قدیم مخطوطات میں ہوتا ہے (ص ۷۴)۔ ان کی تحقیق کے مطابق دارالمصنفین میں کل عربی مخطوطات کی تعداد ۲۶۶ ہے (ص۵۹) اور اسلامی علوم وفنون قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ وفتاویٰ، کلام وعقائد، طب، فلکیات، ریاضیات، تراجم وسیر، تصوف، وغیرہ میں ہر فن سے متعلق مخطوطات کی الگ الگ تعداد بھی لکھ دی ہے۔ اس کے بعد نتائج عامہ کے تحت لکھا ہے کہ ان نجی اور عوامی (سرکاری)

لائبریریوں میں محفوظ عربی اور دوسری زبانوں کے مخطوطات کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ نقصان دہ چیزوں سے ان کو بچانے کے لیے بہت زیادہ احتیاط اور کوشش کی ضرورت ہے اور یہ یقیناً آسان معاملہ نہیں ہے۔ان کی یہ اپیل بھی لائق اعتنا ہے کہ ان مخطوطات کی دیکھ بھال کے لیے ان اداروں کو مالی تعاون کی ضرورت ہے (ص ۷۹)۔ ص ۸۱ سے ۸۷ تک عربی، فارسی، اردو، انگریزی مآخذ کی فہرست دی ہے۔ ص ۹۵ سے ۱۱۱ تک کل آٹھ مخطوطات مسلم الثبوت، محب اللہ، شمس بازغہ، محمود جونپوری، دیوان الصبابہ، ابن ابی حجلہ تلمسانی وغیرہ کے صفحۂ اول کا عکس بھی چھاپا ہے۔ دارالمصنفین کے عام اور اردو مخطوطات پر معارف میں اس سے قبل متعدد مفصل مضامین شائع کیے جا چکے ہیں۔ عربی مخطوطات کے متعلق مصنف کی یہ علمی خدمت قابل قدر ہے۔ لیکن ان مخطوطات کی عام معلومات کے لیے ثانوی مآخذ پر انحصار کیا گیا ہے جو کسی بھی علمی تحقیق کے معیار کی کمی کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ اگر مصنف صرف دارالمصنفین کے ڈھائی سو مخطوطات کا مفصل تعارف اور ان میں سے اب تک جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں ان کی تفصیل اور اکیڈمی کے مخطوطہ سے ان کا موازنہ و مقارنہ کر دیتے تو یہ اور وقیع و عظیم الشان خدمت ہو جاتی۔ بعض جگہوں پر مصنف کی جانب سے وضاحتی نوٹ نے کتاب کی افادیت یقیناً بڑھا دی ہے۔ مصنف کے طرز بیان میں جاذبیت اور تحریر میں جدید عربی اسلوب کی آمیزش ہے۔ البتہ کہیں کہیں ہندوستانیت کی چھاپ بھی نظر آتی ہے۔

عربی میں اردو حروف پ کی جگہ ب، گ کی جگہ غ اور ٹ کی جگہ ت وغیرہ عموماً استعمال ہوتا ہے لیکن اس کتاب میں ملکوں، صوبوں اور بعض اشخاص کے اردو نام کا املا پاکستان، گجرات، بنگال، بانکی پور، پٹنہ وغیرہ اکثر جگہوں پر نظر آیا۔ ممکن ہے جدید عربی میں اب اس طرح کے املا کو قبول کر لیا گیا ہو۔ یہ بات قابل تعجب ہے کہ مصنف نے شبلی اکیڈمی کی جگہ "شبلی نعمانی اکیڈمی" لکھا ہے جو مناسب نہیں ہے۔

حفیظ جونپوری ارباب ادب کی نظر میں: محمد عرفان جونپوری، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۹۶۔ ملنے کا پتہ: عدیلہ پبلی کیشنز، ڈومن پورہ (کساری)، مئو ناتھ بھنجن۔ ۲۷۵۱۰۱۔ قیمت: ۳۷۰ روپے۔ سن طباعت: ۲۰۱۹ء۔ موبائل و ای میل: درج نہیں۔

حفیظ جونپوری کو امیر مینائی سے شرف تلمذ تھا۔ ان کے کلام پر داغ کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ ان کے معاصرین میں ان کا کلام کسی سے کم نظر نہیں آتا۔ جس نے ان کے کلام کا مطالعہ کیا وہ ان کے

سخنورانہ اوصاف و کمالات کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کے اس شعر

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

نے توان کے نام کو قابل رشک شہرت و دیرپائی عطا کی۔ غمگسار اور خم خانۂ دل نامی حفیظ صاحب کے دونوں دیوانوں کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کا اہم سبب ان کی کلاسیکل شاعری کا فنی محاسن سے متصف ہونا ہے۔ مشکل موضوعات و مضامین کو سہل الفاظ میں باندھنے اور ان کو بے تکلفی اور خوبی سے برتنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں آج بھی تازگی محسوس ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب مقدمہ، تعارف اور تقریظ کے بعد پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں ان دیباچوں، پیش لفظوں اور مقدمات کو جمع کیا گیا ہے جو خود حفیظ صاحب کے دواوین اور کلیات پر مشہور و معروف نقادوں شمس الرحمن فاروقی اور پروفیسر محمود الٰہی وغیرہ نے تحریر کیے تھے۔ حفیظ صاحب کا کم یاب سفر نامہ مآل بھی اس باب میں شامل ہے۔ دوسرے باب میں مولانا عبدالسلام ندوی اور مجنوں گورکھپوری وغیرہ کی مطبوعہ تحریریں ہیں۔ باب سوم میں نیرنگ خیال، پیام یار، رسالہ مخزن وغیرہ میں شائع شدہ اور حفیظ صاحب پر ابوذر انصاری اور ایم، نسیم اعظمی وغیرہ کی غیر مطبوعہ تحریروں نے کتاب کی افادیت بڑھادی ہے۔ مخزن میں شائع شدہ غزلوں اور معنون منظومات کی تعداد بھی دی گئی ہے۔ باب چہارم حفیظ صاحب کے چند خطوط سے آراستہ ہے۔ باب پنجم میں حفیظ جونپوری۔ حیات اور شاعری، مرتبہ طفیل جونپوری پر چند تبصرے، حفیظ صاحب پر ایک مراسلہ اور اس کتاب میں جن ارباب ادب کی تحریریں شامل ہیں ان کا مختصراً تعارف کرایا گیا ہے۔ اس طرح کتاب میں حفیظ صاحب کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے علمی و ادبی کمالات کے اعتراف کا خوبصورت مرقع سامنے آگیا ہے۔

مرتب نے مواد کی تلاش و تفحص میں خاصا وقت صرف کیا ہے۔ اسی تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہے کہ حفیظ صاحب کے انتقال پر بخت جونپوری کا ایک غیر مطبوعہ قطعہ اور ان کے نام ایک غیر مطبوعہ خط اور ۱۹۱۲ء کے بعد اب ان کے سفر نامہ مآل کی اشاعت کی خوش بختی ان کے حصہ میں آئی۔ ان کا یہ انکشاف بھی اہم اور ارباب نظر کی توجہ کا مستحق ہے کہ مولانا حسرت موہانی کی غزلوں کے انتخاب ''انتخاب سخن'' میں سب سے زیادہ غزلیں حفیظ جون پوری کی ہیں۔ (ص ۱۳) ان کا مقصد حفیظ صاحب پر آئندہ کام کرنے والوں کو سہولت بہم پہنچانا اور ۱۹۱۸ء میں ان کی وفات کے سو سال پورے ہونے پر ان کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ کتاب کے اندر ص ۲۰، ۱۹ اور ۲۱ پر بعض عبارتوں اور جملوں ک مکرر چھپنے اور پروف کی بعض بھونڈی غلطیوں ہونگیں ص ۱۶، معاصرین شعرا ص ۱۸، ایک معز مقالہ

ص ۲۸، وہادب ص ۲۸، زہد واتقی ص ۱۱۲ وغیرہ کے رہ جانے کی توقع مرتب سے نہیں کی جاسکتی تھی۔

ک ص اصلاحی

دکن سے مغلوں کے تعلقات: از سید نصیر احمد۔ صفحات: ۵۸، قیمت: پچاس روپئے ناشر مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی محبوب نگر (اے۔پی)

مصنف نے اس کتاب میں مغلوں کے دکن کی مختلف حکومتوں سے تعلقات کو مختلف دلائل و حقائق سے واضح کیا ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مغلوں نے نہیں بلکہ مسلم بادشاہوں میں سلطان علاء الدین خلجی وہ پہلا حکمراں تھا، جس نے دکن کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس وقت دکن میں چار مشہور سلطنتیں تھیں: یادو سلطنت، کاکتیہ سلطنت، ہوئے سل سلطنت اور پانڈیوں کی سلطنت۔

اس علاقے میں مرہٹوں نے شیواجی کی قیادت میں ایک آزاد ریاست قائم کرلی تھی، اور جب ۱۶۸۰ء میں شیواجی کا انتقال ہوا تو اس وقت تک مرہٹہ سلطنت کی تاسیس کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ مصنف کا مرہٹہ قومیت کے بارے یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ "ایک وسیع تر ہندو قومیت کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد یہیں سے شروع ہوئی تھی"۔ جو شخصیت جتنی بڑی ہوتی ہے، اس پر الزام بھی اتنے ہی بڑے لگائے جاتے ہیں۔ شہنشاہ اورنگ زیب بھی انہیں لوگوں میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں اس الزام کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ اورنگ زیب عالم گیر نے دکن کی مسلم ریاستوں کو ختم کردیا تھا۔ اس کتاب کا انتساب شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی طرف کیا گیا ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق موضوع کا تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی تیاری میں بہت سے اہم مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ آخر میں کتابیات کے علاوہ اس وقت کے ہندوستان کے چند نقشہ جات کا بھی اندراج ہے۔

(فضل الرحمن اصلاحی)

قرآن پاک کے منظوم تراجم: از ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی شائع کردہ گوشۂ مطالعات فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ صفحات: ۲۴، قیمت درج نہیں۔

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی معارف اور حلقہء معارف میں معروف ہیں۔ یہ ان کا ایک فکر انگیز کتابچہ ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے بڑا اہم ہے۔ انھوں نے اس کتابچہ میں جو حاصل مطالعہ پیش کیا ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنا نازک ہے جتنا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں۔

قرآن مجید کتاب ہدایت ہے۔ اس کے ساتھ لاپرواہی کا رویہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید نثر کی زبان میں اترا۔ اگر منظوم ہونا اتنا ہی ضروری ہوتا تو اللہ تعالی نے نثر کے بجائے

اسے منظوم صورت ہی میں اتارا ہوتا، کیوں کہ اس وقت عربوں کا مزاج بھی یہی تھا کہ وہ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اشعار بآسانی سے یاد کر لیتے تھے۔

حرف ناشر کے طور پر جو چند سطریں لکھی گئی ہیں، اس میں درد جھلکتا ہے کہ یہ کوئی تنقید نہیں ہے، بلکہ اس کی ضرورت تھی: ''آئندہ صفحات میں جو مضمون قارئین کرام کو دعوت نظر دے رہا ہے، وہ کسی شاعر یا مترجم سے کسی ذاتی پرخاش کی بنا پر یا کسی تنقیدی صلاحیت کے اظہار کے لئے زیب قرطاس نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ایک غلط ذہنی رجحان اور منفی قلمی سرگرمی پر روک لگانے کی طرف اہل علم و قلم کی توجہ مبذول کرانے اور عام پڑھنے والوں کو ضلالت و غوایت سے بچانے کے لئے محض ایک دینی ذمہ داری سمجھ کر لوجہ اللہ چند سطریں قلم بند کی گئی ہیں''۔(ص ۲)

اس میں ڈاکٹر نعمانی صاحب نے چار مشہور منظوم قرآن کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے: ۱۔اردو منظوم ترجمہ قرآن مجید از محسن الملۃ مولانا حسن صاحب۔ ۲۔ منظوم اردو مفہوم القرآن از عطا قاضی، ۳۔ قرآن منظوم از پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد۔ ۴۔ منظوم القرآن از بدرالدین خان انجم عرفانی۔اس کتابچے میں ان مترجمین کی جو فنی خامیاں ہیں ان پر گرفت کی گئی ہے۔اور یہ کام ایک فن میں مہارت رکھنے والا ہی انجام دے سکتا تھا۔ایک مثال سے قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں:

فی قلوبہم مرض فزادھم اللہ مرضاولھم عذاب الیم بما کانوا یکذبون

مرض ان کے دل میں ہیں بے شک بھرے خدا ان کے مرض زیادہ کرے
خدا نے مرض ان کے زیادہ کیے عذاب شدید ہوگا ان کے لئے
یہ بدلا ملا ان کو اس بات پر کہ جھٹلایا خالق کو حق بات پر

ڈاکٹر نعمانی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''متن قرآن میں مرض واحد ہے، مگر مترجم نے اس کو جمع بنا دیا ہے۔لفظ ''بے شک'' اور شعر کا دوسرا مصرع حشو ہے۔''عذاب الیم'' کا ترجمہ ''عذاب شدید'' غلط ہے، اور یہ پورا مصرع ناموزوں ہے۔''یکذبون'' کے معنی ہیں ''جھوٹ بولتے تھے'' مگر شاعر نے بالکل الٹا ترجمہ کیا ہے۔بعد کا ٹکڑا بھی حشو ہے، پھر ان دونوں مصرعوں میں ''بات پر'' بطور ردیف استعمال کیا گیا تو ''اس'' کا قافیہ ''حق'' کیسے ہو گیا؟'' (ص ۸)۔(فضل الرحمن اصلاحی)

ذکر عتیق بیاد گار حضرت مولانا عتیق الرحمن سنبھلیؒ ۱۹۲۸-۲۰۲۲ء: خصوصی نمبر ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، صفر المظفر تا جمادی الاولی ۱۴۴۴ھ۔ترتیب: محمد سجود العزیز قاسمی۔صفحات: ۴۶۶۔قیمت: ۴۰۰ روپئے (مجلد)۔پتہ: Alfurqan, 114/31 Nayagaon, Nazirabad,

P.O. Aminabad, Lucknow-226018
Email: monthlyfurqanlko@gmail.com

یہ خصوصی شمارہ مولانا عتیق الرحمن سنبھلیؒ (دیکھئے وفیات: معارف اگست ۲۰۲۲، ص ۶۳۷۔۶۳۸) کی یاد میں ماہنامہ الفرقان نے شائع کیا ہے جس کے پہلے وہ خود مدیر تھے اور اب ان کے چھوٹے بھائی مولانا خلیل الرحمن سجاد نعمانی اس کے مدیر ہیں۔ اس خصوصی شمارے میں پانچ ابواب کے تحت مولانا مرحوم کی زندگی اور آثار کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں ایسے اشخاص کی تحریریں ہیں جنھوں نے مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھا تھا۔ دوسرے باب میں مولانا مرحوم کے طویل قیام لندن کے دوران ان کے احباب و معارف کے تاثرات ہیں۔ تیسرے باب میں مولانا مرحوم کے بارے میں خود ان کے اپنے خاندان کے لوگوں کے تاثرات ہیں۔ باب چہارم میں مکاتیب تعزیت ہیں اور باب پنجم میں مولانا مرحوم کے الفرقان میں شائع ہونے والے مضامین کا انڈکس ،ایک اجمالی خاکے کے ساتھ شامل ہے۔ (ظ۔ا۔خ)۔

ماہنامہ ادراک نو، لکھنؤ، دسمبر ۲۰۲۲ پتہ: 537B/125/104/I, Amber Vihar Colony, Faizullahganj, Lucknow 226020 ایمیل: idrakenau@gmail.com

زر تعاون سالانہ: ۴۰۰ روپئے۔

یہ نیا پرچہ دسمبر ۲۰۲۲ میں ادارہ فکر اسلامی لکھنؤ سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کے مدیر پروفیسر ایاز احمد اصلاحی ہیں جو لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں اور عربی زبان و ادب کے ساتھ مشرق وسطی کے امور کے ماہر ہیں۔ پہلا شمارہ ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں قومیت مذہب کی ضد ہے، مسلم پرسنل لا: کل اور آج، مغرب میں اسلام کی دستک، اور تحریک اسلامی: نفسانی اور نفسیاتی مسائل جیسے مضامین شامل ہیں۔

مدیر ادراک نے اپنے اداریہ میں لکھا ہے: ''ہمارا موقف ہی نہیں ایمان ہے کہ آزمائشیں خواہ کتنی ہی مہیب و خوفناک ہوں، وہ اجتماعی زندگی کا لازمی حصہ ہوتی ہیں۔ اس لئے آزمائشوں سے ڈر کر فتنہ جو عناصر کے آگے سپر ڈال دینا مسئلے کا حل نہیں ہے بلکہ ان مقامات میں ثابت قدم رہ کر حوصلہ مند پیش قدمی اور صبر و قربانی کے ساتھ ہر اٹھتے طوفان کے خلاف بند باندھنا ہی مسئلے کا اصل حل اور درپیش چیلنجوں کا جواب ہے''۔ ہمیں پہلے شمارے کی پی ڈی ایف کاپی ملی ہے، اس لئے مطبوعہ پرچے کے بارے میں رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ پرچے کو ''فکر اسلامی کا ترجمان'' کہا گیا ہے جس سے اس کے فکر اور جھکاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔ آنے والے شماروں سے پرچے کی پالیسی مزید واضح ہو جائے گی (ظ۔ا۔خ)

2 - The Immortals (جاوداں شخصیات) از سید نصیر احمد، آزاد ہاؤس آف پبلشنگ، فلیٹ نمبر C-2، سری رامز آرکیڈ، امراوتی روڈ، اونڈاولی، ضلع گنٹور، آندھراپردیش ۵۲۲۵۰۱۔ ایمیل: naseerahamedsyed@gmail.com

صفحات ۳۶۶ (بڑی تقطیع/مجلد)

قیمت: ۱۰۰۰؍روپئے

یہ کتاب انگریزی اور تلگو زبانوں میں ۱۵۵ مسلم مجاہدین آزادی کے خاکوں پر مشتمل ہے اور ہر خاکہ دونوں زبانوں میں ہے۔ کتاب میں مذکور ہر مجاہد آزادی کا پورٹریٹ بھی مصور کے ہاتھ سے بنا ہوا شامل ہے۔ مصنف سید نصیر احمد (پیدائش ۱۹۵۵) برسوں سے مسلم مجاہدین آزادی پر کام کر رہے ہیں۔ موجودہ کتاب کی پہلی جلد سنہ ۲۰۱۴ میں شائع ہوئی تھی اور اس میں بھی ۱۵۵؍ مجاہدین آزدی کے خاکے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی اور تلگو زبانوں میں چھوٹی بڑی ۲۱؍ کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ان میں سے کئی کا اردو اور ہندی میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ بعض مجاہدین آزادی کا الگ الگ کتابچوں میں تذکرہ کیا گیا ہے جیسے مولانا آزاد، ٹیپو سلطان، اشفاق اللہ خان، گاندھی جی کو بچانے والے بطخ میاں، فاطمہ شیخ وغیرہ جبکہ کچھ کتابوں میں مختلف مجاہدین آزادی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔
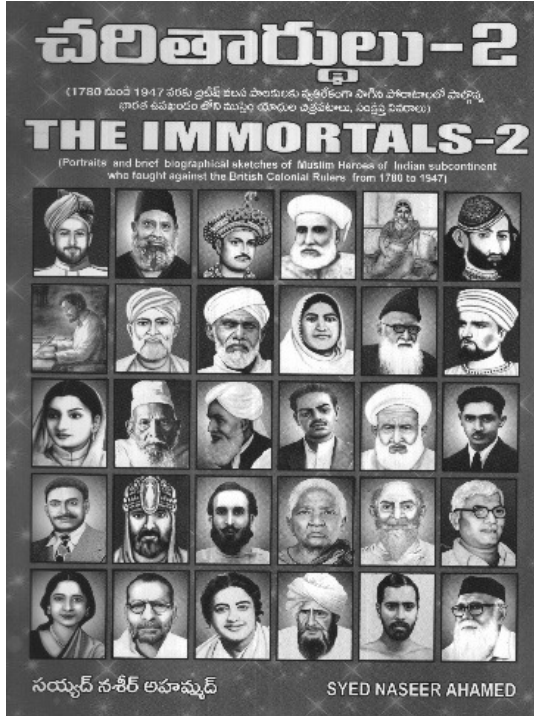
موجودہ کتاب میں ۱۵۵؍ مجاہدین آزادی کے سوانحی خاکے ہیں جن میں سے اکثر کو ہم نے بھلا دیا ہے۔ مصنف نے یہ مواد بہت سی کتابوں سے اخذ کیا ہے جن کی تفصیل کتاب کے آخر میں کتابیات کے تحت موجود ہے۔ "جاوداں شخصیات" کی اس دوسری جلد میں مندرجہ ذیل مجاہدین آزادی کے الگ

الگ سوانحی خاکے ان کی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں:

صوبیدار شیخ احمد، مجنوں شاہ فقیر، آصف جاہ مرزا وزیر علی خان، نواب مرزا شمس الدین احمد خان، سید علوی تنگل، نواب عبدالرحمن خان، مولانا محمد باقر، رائے احمد نواز خان کھرل، سردار حکمت اللہ خان، مولوی امام بخش صہبائی، شیخ پیر شاہ، صوبیدار نادر علی خان، امانت علی، مولانا فیض احمد بدایونی، بخشش علی، نواب احمد علی خان، بیگم عزیزن، مولانا کفایت علی خافی، ولی شاہ، نواب علی محمد خان، پٹھان طرّیباز خان، نواب تفضل حسین خان، دودو میاں، پٹھان صلابت خان، مولانا فضل حق خیر آبادی، نواب سید غالب علی تاتاری، محمد عبداللہ، منشی ذکی الدین احمد، نواب علی بہادر، نواب سعادت علی خان، شہباز فیروز شاہ، مولانا محمد جعفر تھانیسری، دادا عبداللہ، رحمت علی، غدری عبداللہ، حفیظ عبداللہ، علی احمد صدیقی، مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری، مولوی لیاقت حسین، شیخ محمد گلاب، مولانا محمد حسن، چنٹاپلی حسین — جان محمد، سلطان واریان کنّاٹھو کنج احمد حاجی، شاہ محمد زبیر، عبدالرسول قربان حسین، ایم۔عبدالکریم غلام جیلانی، عبدالرشید صدیقی، مولوی وکّوم محمد عبدالقادر، میاں فضلِ حسین، حاجی صاحب ترنگ زئی، حسین رحیم، نواب سی عبدالحکیم صاحب، چودھری افضل حق، مولوی سید خورشید حسین، کیپٹن محمد اکرم، بیگم امینہ طیب جی، ملک وضی الحق، سید پیر صبغۃ اللہ شاہ راشدی، ڈاکٹر سید اکرام رسول، مولانا عبدالرحیم پوپلزئی، نواب خواجہ عتیق اللہ، مولانا محمد میاں منصور انصاری، میر داد خان، غلام نبی شاول، کرنل جی۔کیو۔جیلانی، امجدی بیگم، پیر محمد انصاری مونس، مدورئی جمال محمد، مولانا علی حسین، این۔ ایم۔خواجہ میاں راوتھر، مولانا عبدالحمید باقوی، بطخ میاں انصاری، سکینۃ الفاطمہ، محمد میراراوتھر، وی۔ ایم۔عبیداللہ، محمد خان بنگلوری، بیگم سکینہ لقمانی، عبدالرحمن ریا، بیگم صفیہ سوم، شاہ محمد عزیر منعمی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، شاکر علی بیرسٹر، فریدالحق انصاری، بیگم عطیہ فیضی، بیگم صغریٰ خاتون، عبدالکریم لنجے، نعمۃ اللہ انصاری، شریفہ حمید علی، مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر شوکت اللہ شاہ انصاری، عبدالحمید انصاری، شیخ علی صاحب، ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی، مولانا محمد اسماعیل سنبھلی، بیگم ریحانہ عباس طیب جی، سید سجاد ظہیر، آباد خان، محمد عبدالوحید خان، مولانا عثمان غنی، شاہ محمد عمیر، حافظ محمد ابراہیم، سید شاہ محمد حسن، خان شاکر علی خان، علامہ سید سبط الحسن، شیخ عبدالمجید سندھی، بیگم ثریّا بدرالدین طیب جی، سہیل عظیم آبادی، سید فدا حسین، میر تاج محمد خان، میجر ملک منور خان، بیگم خورشید خواجہ، محمد چراغ علی، میاں محمد شاہ، کرنل سید محمد اسحاق، مفتی ضیاء الحسن، ڈاکٹر سید شاہ وجیہ الدین منہاجی، شیخ عبدالوہاب، ناظر حسین، بیگم فاطمہ اسماعیل، مولانا امداد صابری، بیگم زہرہ انصاری، چودھری منگل خان

میواتی، سید لطیف مستارو، محمد حنیف، دریاخان، مولانا سلامۃ اللہ بیگ، یحییٰ علی خان، سید ملّا ربی یابی، سید ملّا محی الدین، کرنل رضا محمد ارشد، انوار ہروانی، شیخ امام صاحب، ڈاکٹر وارث خان، شیخ محبوب آدم، محمد جلال الدین، بیگم صوفیہ کمال، میر فیاض علی ہاشمی، سید عبدالعظیم، بیگم زہرا داؤدی، سید عبدالعلا، خان عبدالولی خان، مولانا عبدلقیوم رحمانی، مہرتاج بیگم، سید محمد شرف الدین قادری، مولانا محمد اسحاق بھٹی، امیر حمزہ ایم۔ کے۔ ایم، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، منکادوان محمد حاجی، ملا اکبر علی، مرزا نسیم بیگ چنگیزی، شیخ رمضان قریشی، بیگم حمیدہ حبیب اللہ، مولانا شوکت علی ہاشمی، محمد یونس لوہیا، محمد باجی۔ اللہ پاک ان سب کے جہاد کو قبول کریں۔

سید نصیر احمد نے بھولے ہوئے مسلم مجاہدین آزادی کو یاد دلانے کا بیڑا اٹھایا ہوا ہے اور اس کام میں وہ بہت کامیاب ہیں۔ وہ اس کام کے لئے اپنے پاس کے علاقوں میں لکچر ٹورز اور نمائشوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ اس کام کے لئے انھوں نے اپنا تن من دھن لگا دیا ہے جس کے لئے وہ شکریے کے مستحق ہیں (ظ۔ ا۔ خ)۔

ادبیات

غزل

محمد طارق غازی

وھٹبی، اونٹاریو۔ کینیڈا

اک درد سے اس قوم کو آرام نہ آیا
منبر کی صداؤں سے بھی اسلام نہ آیا

دنیا وہی مردودِ فراست ہے ابھی تک
ہم نے جو پڑھا سیکھا وہ کچھ کام نہ آیا

تنہا یہ سفر طے کیے جاتا ہوں میں دن رات
ہمراہ کوئی چلنے کو دوگام نہ آیا

گلشن بھی خیالی تھا، خیالی تھی مری بزم
اس انجمنِ گل میں گل اندام نہ آیا

تقدیر کے میلے میں ہے ہر ترک و عرب گم
وہ صبح کا بھولا بھی سرِ شام نہ آیا

مرجاتے ہیں لاکھوں فقط اک جنبشِ لب سے
قاتل پہ مگر آج بھی الزام نہ آیا

ہر شہر میں بن بنتا ہے ہر چار قدم پر
اک بن کے مقدر میں مگر رام نہ آیا

نالے تو بہت اٹھتے ہیں راہوں کے جگر سے
سناٹے کا ہلکورہ لبِ بام نہ آیا

ناموس سے کمتر ہے تری انجمنِ دہر
قرعہ تری خلوت کا مرے نام نہ آیا

غزل

جمیل مانوی

سہارنپور۔ ۹۸۹۷۵۲۳۸۱۵

زندگی تھی ترے پہلو میں تو یہ مقتل کیوں تھا
میری آنکھوں سے یہ پہلو ترا اوجھل کیوں تھا

اس لیے چپ ہیں کہ فریاد کی طاقت ہی نہیں
بے گناہوں پہ ترا جبرِ مسلسل کیوں تھا

میری دنیا تھی تو کیوں چین سے رہنے نہ دیا
میرے اطراف میں انسانوں کا جنگل کیوں تھا

میں نے مانا کہ تمہیں مجھ سے محبت ہی نہ تھی
پھر مرے نام سے یہ آنکھ میں جل تھل کیوں تھا

دل میں جب روز تری یاد چراغاں کرتی
پھر یہ دل آج تری یاد سے بوجھل کیوں تھا

ہاں تجھے بھولنا دشوار ہے ناممکن ہے
یہ بتادے کہ تو اتنا مکمل کیوں تھا

کس لیے تھی ترے چہرے پہ اداسی کی جھلک
چاندنی رات کے ماتھے پہ یہ کاجل کیوں تھا

زندگی یوں بھی ترے نام پہ کٹ سکتی تھی
دل کے آفاق پہ یہ درد کا بادل کیوں تھا

کس لیے تھا مرے جذبوں میں تلاطم مت پوچھ
یہ بھی مت پوچھ ترے پیار میں پاگل کیوں تھا

عمر اس موڑ پہ لائی ہے کہ ہنستے نہ بنے
ضبط کہتا ہے کہ دل درد سے بوجھل کیوں تھا

غزل

جناب رئیس احمد نعمانی

ہمدرد نگر، جمال پور۔ علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۲

گلِ مقصود کو ہر گز نہ دیکھے گا ہتھیلی پر
نگاہیں جس کی رہتی ہیں سدا چمپا چمیلی پر

وفا کی راہ میں اندیشۂ سود و زیاں کیسا
کہ رہتا ہے ہمیشہ ہی ہمارا سر ہتھیلی پر

مرے دشمن یہی بس تیرا معیارِ شجاعت ہے
اکیلا پاکے بچوں کو کیا حملہ حویلی پر

ترے بے معنی جملوں کی زمانے بھر میں شہرت ہے
بھروسا کیوں کرے کوئی بتا تیری پہیلی پر

ملامت ، چاہنے والوں کو کرنا نامناسب ہے
دل اکثر آہی جاتا ہے عزیزو، ساتھ کھیلی پر

نتیجہ ویسا ہی ہوگا کروگے تم عمل جیسا
نہیں آئے گا پھل انگور کا ہر گز کٹیلی پر

زمانہ ایسا بھی تاریخ کی آنکھوں نے دیکھا ہے
بکا کرتے تھے جب نادار، دمڑی اور دھیلی پر

ہوا کرتے تھے جو تاریخ کی تاریک صدیوں میں
مظالم اب بھی ہوتے ہیں وہی زنداں میں جیلی پر

یونہی شیطان کے ہمراہ خوش ہے آج کا انساں
بھروسا کرتی ہے جیسے سہیلی اک سہیلی پر

کیا برباد دنیا نے رئیس اب کیا شکایت ہے
بھروسا کیوں کیا اے دوست اس شیطاں کی چیلی پر

رسید کتب موصولہ

اسلامی زندگی (پیدائش سے جنت تک): مفتی عبدالرزاق خاں، مرتب مفتی عبدالمعبود قاسمی، مالوہ بک ڈپو، ترجمہ والی مسجد کے پاس، موتیا پارک، صفحات ۷۴۴۔ سالِ اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۵۰ روپے۔

المختارات العربیہ: م، ع، سلیم خاں، فی ثوبہ الجدید (مع تدریبات متنوّع الاسلوب والمنہج) مرتبین: عثمان حسن، محمد ہارون، عاصم کمال و شاہد اقبال، دارالعلوم دیوبند، صفحات ۳۹۱۔ سال اشاعت ۱۴۴۲ھ، قیمت: درج نہیں۔

تعلیمی سفر نامے: ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد، مرتب ڈاکٹر شمس بدایونی، اپلائیڈ بکس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی، صفحات ۳۹۲، سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۵۰۰ روپے۔

جوش ملیح آبادی کا رسالہ ''کلیم'' (تعارف اور تجزیہ انتخاب اور اشاریہ): جناب جاوید اختر علی آبادی دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔ صفحات، ۳۹۱ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۶۰۰ روپے۔

چھاؤں سے دھوپ تک (مجموعۂ نظم): جناب مصداق اعظمی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار جامع مسجد دہلی، صفحات ۲۵۰۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۳۵۰ روپے۔

حاصل تحقیق (ہندوستانی فارسی ادب کے بارے میں چند مضامین): پروفیسر شریف حسین قاسمی، غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی،۔ صفحات ۴۴۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۶۰۰ روپے۔

دنیا کے آزاد ممالک تفصیلی جائزہ : مولانا سید عنایت اللہ ندوی، مکتبہ ندویہ، ندوہ روڈ، لکھنؤ۔ صفحات ۶۰۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت ۵۵۰ روپے۔

زاویہ نگاہ (تنقیدی و تحقیقی مضامین): جناب عارف عزیز، مرتب ڈاکٹر مرضیہ عارف، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی۔ صفحات ۲۲۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت: ۴۰۰ روپے۔

شاہین کی پرواز : ڈاکٹر عبدالرؤف، بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ۔ صفحات ۲۰۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۰۰ روپے۔

مفتی عبدالرزاق خاں حالات و خدمات مع تاریخ ترجمہ والی مسجد: مفتی عبدالمعبود قاسمی، جامعہ اسلامیہ عربیہ مسجد ترجمہ والی، موتیا پارک، بھوپال۔ صفحات ۶۶۸۔ سال اشاعت ۲۰۱۰ء، قیمت: ۲۰۰ روپے۔

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ایمیل کا پتہ:info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین ومقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھا لیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

۱۲۔ مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ قدیم اور کلاسیکی امور کے ساتھ ساتھ مسلمانان ہند کے جدید مسائل جیسے تعلیمی، لسانی، تاریخی، سیاسی اور ثقافتی امور پر بھی معارف کے لئے لکھیں تاکہ موجودہ نسل کو فکری غذا ملے اور موجودہ پسماندگی سے نکلنے کا راستہ ہموار ہو۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	350/-
الغزالی	300/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم (اول)	250/-
شعر العجم (دوم)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-
شعر العجم (چہارم)	200/-
شعر العجم (پنجم)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-
خطبات شبلی	150/-

کتاب	قیمت
موازنہ انیس و دبیر	250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
کلیات شبلی (اردو)	220/-
کلیات فارسی (فارسی)	--
مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-
انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print JAN 2023 Vol. 210/01

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India

Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	״ ״	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	״ ״	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	״ ״	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	״ ״	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	״ ״	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-